دسمبر 1964ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اس شمارے میں ہم مولانا تھانوی ؒ کے اس فتوے پر تنقید کرنا چاہتے تھے جس کا حوالہ جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے دیا ہے لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعض ثقہ اور ذی علم معتقدین نے وضاحت کر دی ہے کہ اوّل تو اس فتوے کی نسبت ہی مولانا کی طرف مشکوک ہے پھر اس کا تعلق انگریزی دور کی ان دیسی ریاستوں سے ہے جن کی حیثیت آزاد حکومتوں کی نہیں بلکہ نوابیوں اور تعلقوں کی تھی۔ ان میں ریاست کی سربراہی قوم کے ووٹوں سے نہیں بلکہ وراثت اور ولی عہدی کے ذریعے سے مورث سے وارث کو منتقل ہوتی تھی۔ جس سے بعض اوقات یہ صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ ذکور میں سے کوئی وارث موجود نہ ہونے کے باعث اناث میں سے کوئی صغریٰ یا کبریٰ گدی کی وارث بن جاتی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مفتی کے جواب کا تعلق سوال کی نوعیت سے ہوتا ہے اس وجہ سے اس فتوے کو یہاں کے حالات پر منطبق کرنا بالکل غلط ہے۔ مولانا نے حکومتوں کی جو تقسیم کی ہے وہ بھی ان کی ایک خاص اپنی ذہنی تقسیم ہے، نہ وہ دنیا کے موجودہ مروجہ اشکال حکومت پر منطبق ہوتی، نہ پاکستان کے دستور و نظام پر۔ علاوہ ازیں مولانا نے فتوے میں بطور استدلال ملکہ سبا کی حکمرانی کا ذکر کیا ہے لیکن مولانا کے ایک معتقد نے ان کی تفسیر کا ایک حوالہ ہم کو دکھایا جس میں انہوں نے اپنی یہ دلیل خود ہی ختم کر دی ہے اور بعینہٖ وہی موقف اس مسئلے میں اختیار کیا ہے جو اپنے پچھلے شمارے والے مضمون میں ہم نے اختیار کیا ہے۔ ایسی صورت میں اس فتوے پر کوئی بحث بالکل غیر ضروری ہے۔ ہم مفتی شفیع صاحب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ خود اس صورت حال کی وضاحت کر دیں گے اور اگر ان کی رائے کی بنیاد مجرد اس فتوے ہی پر ہے تو اپنی اس رائے پر بھی

نظرِ ثانی کریں گے۔

انتخابات کے نئے پروگرام کے مطابق چونکہ صدر کے انتخاب کا مرحلہ اب بالکل سامنے ہے اس وجہ سے اس موقع پر چند باتیں ہم بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے کہنا چاہتے ہیں جن کے فیصلے ہی پر اب اس ملک کی قسمت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلے ہمارے ان نمائندوں کو یہ بات پیش نظر رکھنی ہے کہ سیاست میں بیجا عقیدت ایک غیر فطری مداخلت ہے۔ اگر مس فاطمہ جناح کا آپ احترام کرتے ہیں تو یہ احترام سر آنکھوں پر لیکن صدر کا انتخاب کرتے وقت آپ اس احترام کو بالائے طاق رکھ کر معاملے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ آپ ملت کے لئے ماں کا انتخاب نہیں کرنے چلے ہیں بلکہ ریاست کے لئے صدر کا انتخاب کرنے چلے ہیں۔ اس منصب کی عظیم ذمہ داریوں کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں سے جس شخصیت کو آپ موزوں تر پائیں اس کو ووٹ دیں۔ اپنی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اپنے ذاتی جذبات عقیدت کو مزاحم نہ ہونے دیں۔ ورنہ اس کا خمیازہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور صرف ۸۰ ہزار ممبروں ہی کو نہیں بلکہ دس کروڑ پاکستانیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس معاملے میں آپ کی غلطی اس بات کا بھی ثبوت ہوگی کہ ابھی ہم پاکستانیوں میں جمہوریت کی ذمہ داریوں کا شعور نہیں پیدا ہوا ہے۔ جو قومیں آج جمہوری نظام کامیابی سے چلا رہی ہیں ان کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے عہدوں اور مناصب کے لئے اشخاص ان عہدوں کے تقاضوں کے مطابق منتخب کرتی ہیں۔ افسوس ہے کہ متحدہ محاذ نے ایک خالص سیاسی و انتظامی معاملے میں آپ کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور آپ کو ایک سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔ یہ درحقیقت حصول اقتدار کے لئے ایک سازش ہے جس کو اگر آپ نے ناکام نہ بنا دیا تو آپ کا ملک سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس اندیشے کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ سیاسیات میں سازشی ہتھکنڈوں کے استعمال کا ردِ عمل بعض اوقات نہایت خطرناک نتائج پر منتہی ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھئے کہ اس ملک میں اسلام نہ صدر ایوب کے ہاتھوں آئیگا نہ مس فاطمہ جناح کے۔

صدر ایوب اگر اسلام سے بعید ہیں تو مس فاطمہ جناح بعید تر۔ علیٰ ہذا القیاس مسلم لیگ اور متحدہ محاذ سے بھی اسلام کے لئے کسی خیر کی امید نہ رکھئے۔ عملاً یہ دونوں ہی دین سے دور ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ متحدہ محاذ میں ایسی پارٹیاں بھی شامل ہیں جو عقیدۃً بھی اسلام کی باغی ہیں جب کہ مسلم لیگ میں کم از کم اسلامی نظام کے کھلم کھلا مخالفت کرنے والے موجود نہیں ہیں۔ متحدہ محاذ کے ساتھ اسلامی نظام کی حامی جو جماعتیں شامل ہیں اوّل تو محاذ کے اندر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ حقیقت بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سے اچھی طرح واضح ہو چکی ہے، ثانیاً ان میں سے کم از کم ایک جماعت ـــــ جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے کہیں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے۔ متحدہ محاذ کی اسلام دشمن جماعتیں اسلام کی مخالفت بے دلیل کریں گی اور جماعت اسلامی کے امیر صاحب اور ان کے اتباع ان کے تحت اپنی نرالی فقاہت سے شرعی دلیلیں ایجاد کریں گے۔ جہاں تک مس فاطمہ جناح کا تعلق ہے نہ وہ مذہب کی عالمہ ہیں، نہ فکراً و عملاً ان کو مذہب سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہے۔ ان کی طبعی مناسبت دین بیزاروں سے جتنی ہو سکتی ہے، دینداروں سے قربت ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ آپ اگر ان کو اپنے ووٹ سے برسر اقتدار لاتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ آپ نے ان کی دین بیزاری کو بھی اپنے اوپر مسلط کر لیا بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ آپ نے ہر شعبہ زندگی میں مرد و زن کی کامل مساوات کے خالص مغربی نظریے کو اعتقاداً و عملاً تسلیم کر لیا۔ اس کا قدرتی ردعمل جو آپ کے معاشرے پر ہوگا وہ یہ ہوگا کہ ان کے اقتدار کے چند دنوں کے اندر اندر آپ کا معاشرہ اتنا تبدیل ہو جائے گا کہ پھر قیامت تک اس کے اسلام کی طرف مڑنے یا موڑنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہ جنگ جو آج اسلامیت و مغربیت میں ہو رہی ہے وہ مغربیت کی فتح پر ختم ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ صدر ایوب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسلام سے ناواقف ضرور ہیں لیکن اسلام سے بیزار نہیں ہیں۔ ان کا مزاج سپاہیانہ اور ان کے اندر حمیت ملی و قومی ہے۔ انہوں نے غلطیاں ضرور کی ہیں لیکن ان کی اصلاح کی راہ مسدود نہیں ہوئی ہے۔ ان سے لڑنے کے لئے میدان کھلا ہوا ہے اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں اصلاح پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ کوئی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں ہیں جو ٹوٹ تو سکے لیکن لچک نہ سکے۔ وہ چند سال میں

بہت بدلے ہیں اور آئندہ بہت بدل سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں وہ کامیاب ہو گئے تو ہمیں امید ہے کہ وہ عوامی آدمی بھی بن جائیں گے اور مذہبی پہلو سے بھی ان میں مفید تبدیلیاں آئیں گی۔

تیسری بات یہ یاد رکھئے کہ آپ کو صرف جمہوریت ہی کی نہیں بلکہ مستحکم حکومت کی بھی ضرورت ہے۔ آپ کے ملک کے عوام برطانیہ کے عوام کی طرح تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور نہ آپ کی سیاسی پارٹیاں وہاں کی پارٹیوں کی طرح اپنے حقوق و فرائض کے معاملے میں تربیت یافتہ ہیں۔ اس امر کو نظر انداز نہ کیجئے کہ یہاں عوام کو آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے اور سیاسی پارٹیاں بسا اوقات مفاد ملک کے خلاف سرگرمیوں میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ پھر ہمارے ملک کے دو بازو ہیں اور دونوں میں ہزار میل کا فاصلہ بھی ہے اور بدقسمتی سے مفسد پارٹیوں نے دونوں کے اندر شدید قسم کی غلط فہمیوں کی تخم ریزی بھی کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا صورت پیش آ جائے۔ ایسے حالات میں آپ کے لئے جمہوریت کی وہ شکل جس کی علم بردار مس فاطمہ جناح ہیں، نہایت خطرناک ہے۔ مس فاطمہ جناح کے پیچھے جو پارٹیاں جمع ہوئی ہیں ان کے درمیان کوئی رابطہ ایوب دشمنی کے سوا نہیں ہے۔ صدر ایوب اگر خدانخواستہ ہٹ گئے تو ان کا یہ رابطہ بھی ٹوٹ جائے گا اور پھر یہ ایک دن کے لئے بھی کوئی مضبوط حکومت نہ بنا سکیں گی۔ چودھری محمد علی صاحب نے یہ مینڈکوں کی پنسیری باندھی ہے جس کو باندھے رکھنے پر مس فاطمہ جناح قادر نہ ہو سکیں گی اور خود چودھری صاحب کا تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ اندرون خانہ سیاست کے تو ماہر ہیں لیکن میدان میں نکل کر حالات کا مقابلہ کرنے کے معاملے میں سخت بودے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ابتری اور انتشار کی شکل میں ظاہر ہوگا اور پھر دو ہی امکانات سامنے ہیں۔ یا تو کوئی انقلاب ظہور میں آئے یا خدانخواستہ ہم آزادی ہی سے محروم ہو بیٹھیں۔ ان دونوں میں سے کوئی امکان بھی گوارا کئے جانے کے لائق نہیں ہے، اس وجہ سے صدر ایوب کو ووٹ دیجئے تاکہ آپ جمہوریت کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کو بھی مضبوط بنا سکیں۔ انگریزوں کا نظام بالکل غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔ یہ تو ان کے مخصوص قسم کے ٹھنڈے سیاسی مزاج کی برکت ہے کہ وہ ان کے ہاں چل رہا ہے۔ اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے مضبوط عوامی قیادت اور ہمہ گیر عوامی سیاسی شعور

ناگزیر ہیں۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں مفقود ہیں اس وجہ سے ہمارے لئے ان کی ریس خطرناک ہوگی۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی استحکام کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہم پچھلے شمارے میں لکھ چکے ہیں کہ اس کے لئے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ہمیں کمزور قوم کی حیثیت سے جینے کا ایک لمحے کے لئے بھی تصور نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ حقیقت بھی یاد رکھئے کہ حکومت کا مزاج فاعلانہ ہونا چاہیئے نہ کہ منفعلانہ۔ اس کی اصل سرشت مردانہ ہے نہ کہ زنانہ۔ عورت کا مزاج منفعلانہ ہوتا ہے اور اس کے اصل فطری فرائض کے لحاظ سے اس کا یہی مزاج اس کے لئے موزوں ہے۔ اپنے اس مزاج کے لحاظ سے عورت حکومت کے لئے فطرتاً ناموزوں ہے۔ اگر حکومت عورت کے سپرد کر دی جائے تو حکومت کا مزاج بھی اس کے اثر سے بگڑ کر زنانہ ہو جاتا ہے جس سے اس کی صلاحیت کار بالکل برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم السیاست کے مشہور ماہر بلنٹچلی نے تاریخی اور فلسفیانہ دونوں ہی پہلوؤں سے ثابت کیا ہے کہ حکومت کے معاملات میں عورت کی مداخلت حکومت کے مزاج کو بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ امریکہ کے لوگوں نے جمہوریت اور مساواتِ مرد و زن کے نظریہ پر ایمان رکھنے کے باوجود آج تک اپنے ہاں کسی عورت کو صدر نہیں بنایا۔ انگریز وراثت اور ولی عہدی کے نظام کی مجبوریوں کی وجہ سے کبھی کبھی کسی عورت کو بادشاہ بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں بادشاہ محض ایک مقدس نشان ہے، حکومت ان کے ہاں چرچل، ایٹلی، ایڈن، میکملن اور ولسن جیسے لوگوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس وجہ سے اس نے قوامیت اور سربراہی کا منصب مرد کے سپرد کیا ہے۔ عورت کو نہ گھر کا قوام بنایا ہے نہ باہر کا۔ ہمارے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں پکڑائے گی۔ آپ کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اپنی حکومت کا مزاج و کردار زنانہ بنا کر اور اپنے پیغمبرؐ کی ہدایت کی مخالفت کر کے فلاح پا سکیں گے؟ ہمیں اپنی حکومت کے مردانہ مزاج و کردار کو نہ صرف باقی رکھنا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو ترقی دینا ہے اس وجہ سے اس انتخاب کے موقع پر ان لوگوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیجئے جو ہماری حکومت کے مزاج کو نسوانی اور نامردانہ بنانا چاہتے ہیں۔

اس نازک موقع پر اس بات کو بھی یاد رکھئے کہ دین اور عقل دونوں سے بے بہرہ جماعت اس ملک میں اگر کوئی ہے تو جماعتِ اسلامی ہے۔ اس کی الٹی منطق اور اس کے دینی فہم دونوں کا جائزہ ہم پچھلے شماروں میں لے چکے ہیں اور آئندہ ہم اس کے سارے فکر و فلسفہ کا جائزہ لینے والے ہیں۔ یہ جماعت اب صحیح فکر اور صحیح عمل کی توفیق سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کی ہر بات الٹی ہوتی ہے اور جو قدم بھی یہ اٹھاتی ہے اس سے اپنی بے راہ روی اور ضلالت کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اس جماعت نے مس فاطمہ جناح کی حمایت میں جو دلیل پیدا کی ہے اس کی بنیاد ملک کے موجودہ حالات کی نزاکت پر رکھی ہے، یعنی حالات بہت پیچیدہ اور نازک ہیں اس وجہ سے اسے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت پر مجبور ہونا پڑا۔ غور کیجئے کہ نازک اور پیچیدہ حالات دنیا میں مردوں کے حل کرنے کے ہوتے ہیں یا عورتوں کے؟ جس قوم کے مرد ملکی مسائل کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر ہو جائیں گے، کیا اس کے مسائل ایک عورت حل کرے گی؟ پھر اس سے زیادہ قابلِ ماتم بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ لوگ مجبوری کا عذر پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اضطرار میں کوئی جان بچا لینے کے لئے خنزیر کھا لیتا ہے اسی طرح انہوں نے مس فاطمہ جناح کی صدارت گوارا کر لی ہے، دوسری طرف یہ حال ہے کہ ملتان میں اس جماعت کے قیم نے مس فاطمہ جناح کو "نورِ خدا" سے تشبیہ دی۔ بتایئے اب ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت ہے؟ جن لوگوں کو مس فاطمہ جناح کے اندر بھی نورِ خدا نظر آئے انہیں کہاں نورِ خدا نظر نہیں آ سکتا؟ یہ مس فاطمہ جناح کی خوبی نہیں ہے کہ آج ان کے اندر نورِ خدا پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ صرف ان حضرات کی آنکھوں کی خیرگی کا کرشمہ ہے کہ انہیں ان کے اندر بھی نورِ خدا نظر آنے لگا ہے۔ جب کسی کی غیرتِ ایمانی مردہ اور بصیرتِ روحانی سلب ہو جاتی ہے تو اس کو اسی طرح کے عجائب نظر آتے ہیں۔ آخر دنیا نے گایوں اور بچھڑوں کی پوجا اور پتھروں اور مورتوں کی پرستش یوں ہی تو نہیں کی ہے!!

یہ امر بھی یاد رکھئے کہ جو لوگ اپوزیشن میں ہوتے ہیں ان کے لئے جھوٹے سچے وعدے کرنے اور امیدوں کے سبز باغ دکھانے کے بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ وہ انتظام کی ذمہ داریوں اور حکومت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ ہوتے ہیں اس وجہ سے بڑی آسانی سے لوگوں کو بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ بیک قول رات دودھ اور شہد کی نہریں جاری کر سکتے ہیں، جمہوریت کی بحالی کرا سکتے ہیں، کتاب و سنت کے ادارے ملک کے کونے کونے کو جگمگا سکتے ہیں اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ کر دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ وعدہ ہوتا ہے اور اس کے لئے انہیں الفاظ کے

سوا اور کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ جو برسرِ اقتدار ہو اس کو یہ آسانیاں حاصل نہیں ہوتیں، اس کو سارا مسالہ نقد نقد کرنا پڑتا ہے اور نقد اور ادھار میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے۔ اپوزیشن کے بزرگوں میں سے جن لوگوں کے اقتدار کا ابھی آپ نے تجربہ نہیں کیا ہے ان کے بارے میں ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہے لیکن ان میں سے جن جن حضرات کے اقتدار کا تجربہ آپ صوبوں یا مرکز میں کر چکے ہیں ان کے دورِ اقتدار کو حافظے پر ذرا زور ڈال کر یاد کیجئے کہ جب ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ تھی تب انہوں نے کیا بنایا ہے اور پھر اسی سے اندازہ کیجئے کہ آئندہ اگر انہیں آپ نے اقتدار کی امانت سونپی تو وہ کیا بنائیں گے۔

یہاں اپوزیشن کے تمام آزمودہ افراد کا تذکرہ تو بہت طولانی ہو جائے گا جس کیلئے گنجائش نہیں ہے اس لئے ہم صرف چودھری محمد علی صاحب کے حوالے پر کفایت کرتے ہیں۔ چودھری صاحب اپوزیشن کے گل سرسبد ہیں اور ہم بھی ان کی قابلیت کے مداحوں میں ہیں۔ یہ حکومتِ پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی رہ چکے ہیں، وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں اور وزیراعظم بھی۔ دل میں ان کیلئے چونکہ ایک احترام ہے اس وجہ سے ان کے دور کی بعض باتیں حافظے میں محفوظ ہیں۔ چودھری صاحب مالیات کے ماہر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ چودھری صاحب کے دور کے لحاظ سے آج پاکستان کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہے، چودھری صاحب شہری آزادیوں اور جمہوریت کے بڑے دلدادہ ہیں لیکن چودھری صاحب کے دور میں جو سیفٹی قوانین نافذ رہ چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ آج کے قوانین ان سے ہزار درجے لبرل ہیں۔ چودھری صاحب نے ایک "اسلامی دستور" بھی بنوایا تھا جس میں "لاکمیشن" نامی ایک چیز بھی تھی، میں اس کے متعلق بھی ذاتی تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مشاورتی کونسل کی پوزیشن قانونی لحاظ سے اس کمیشن سے کہیں زیادہ باوقار اور مضبوط ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ کونسل کوئی کام کرے یا نہ کرے۔ مجھے یاد ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے دور میں کشمیر کے مسئلے کو بھی زندہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی مسیحائی فدا کارگر نہ ہوئی لیکن صدر ایوب نے نہ صرف کشمیر کے مسئلے کو ایک زندہ مسئلہ بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے لئے ایک اور مستقل دردِ سر بھی پیدا کر دیا ——— ان باتوں کے ذکر سے مقصود چودھری صاحب کی صلاحیتوں کی تحقیر نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آج اپوزیشن میں ہونے کی وجہ سے وہ جس بیدردی سے تنقید اور جس فیاضی سے وعدے کر رہے ہیں اس کے متعلق ان کے ماضی کو دیکھ کر فیصلہ کیجئے۔ ان کے بارے میں شروع سے ہماری ایک رائے ہے جو آج ہم بلا کسی ارادۂ تحقیر کے ظاہر کر رہے ہیں کہ ان میں ایک سگھڑ بیوی کی تو ساری صفات موجود ہیں لیکن وہ قوامیت کی صفات سے بالکل عاری ہیں۔

محترمہ مس فاطمہ جناح کو اب تک اس کے سوا کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے کہ وہ سال میں چند مخصوص مواقع پر ایک خاص ڈھنگ کے بیانات دیتی رہتی ہیں۔ انہیں سیاسی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ان میں کسی قومی خدمت کا تو ذکر کیا، کسی سماجی خدمت کا بھی کوئی ذوق و شوق کبھی محسوس نہیں ہوا۔ جمہوریت کا لفظ وہ بار بار دہراتی ہیں لیکن اس کے لئے جس مزاج اور جس جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر مفقود ہے۔ ملک کی صدارت جیسے منصب کے لئے اگر آپ نے محض ان کی انتخابی تقریروں پر اعتماد کر کے انتخاب کیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ صدارت کے منصب کی ذمہ داریوں کے لئے قوت، قابلیت اور ساتھ ہی صبر اور بردباری کی ضرورت ہے، وہ ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ متوقع اس بات کی ہوں گی کہ ان کے احکام کی تعمیل کن فیکون کی طرح کی جائے اور لوگ ان کا احترام قائداعظم کی طرح کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوگی، پھر کیا ہوگا، اس کے نتائج کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔

جنرل اعظم فطرتاً ایک ڈکٹیٹر ہیں۔ ختمِ نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جو مارشل لا جاری ہوا تھا اس میں ان کا اصل مزاج بے نقاب ہو چکا ہے۔ وہ جب جمہوریت کا نام لیتے ہیں تو واقعی ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔ یہ ان کے اپنے فکری انقلاب کا کرشمہ ہے یا صدر ایوب کی مخالفت کا جوش ان کو اس نیک راہ پر لایا ہے، اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم صرف یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ان کے اوپر اعتماد کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ جمہوریت کا یہ عشق ان کے اندر ایوب دشمنی کی راہ سے پیدا ہوا ہو۔ اگر خدانخواستہ بات یہی نکلی تو ان کے اوپر آپ کا اعتماد نہایت مہلک نتائج کے دروازے کھول سکتا ہے۔ اگر فی الواقع ان کے اندر کوئی نظریاتی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کو انہیں کچھ عرصہ سماجی خدمات میں مصروف رہ کر پختہ کرنا چاہئے۔ بغیر اس ریاضت کے اگر وہ "مادرِ ملت" کی آڑ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے دوڑ لگائیں گے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ان کے ہاتھوں جمہوریت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ چیز خود ان کے بھی سوچنے کی ہے اور وہ نہ سوچیں تو بی۔ ڈی کے ممبروں کے سوچنے کی ہے۔

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

۴۴

تفسیر سورۂ بقرہ

۹۰ - خاتمہ سورہ - آیات ۲۸۴ - ۲۸۶

اب یہ عظیم سورہ ختم ہوگئی - آگے کی آیات بطور خاتمہ ہیں - اس خاتمہ میں پہلے تو یہ تنبیہ ہے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے - وہ بندوں کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے - وہ ہر چیز کا حساب کرے گا اور اپنے اختیار مطلق سے جس کو مغفرت کا سزاوار قرار دے گا اس کی مغفرت فرمائے گا اور جس کو سزا کا مستحق پائے گا اس کو سزا دے گا - کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے ارادے اور فیصلے میں مداخلت کر سکے -

دین کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کا صحیح شعور اس امانت کا اہل بناتا ہے جو اس سورہ میں امت مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو فراموش کر دینے کے سبب سے یہود اور نصاریٰ اس امانت کی سعادتوں سے محروم ہوئے - اس اہمیت کی وجہ سے جس طرح جگہ جگہ اس سورت میں اس کی یاد دہانی کی گئی ہے اسی طرح خاتمہ پر بھی اس کی یاد دہانی فرمائی -

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کے رسولؐ اور اس کے ایمان لانے والے بندوں نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے - یہی اس پر ایمان لانے کے سزاوار تھے - یہ یہود و نصاریٰ کی طرح خدا کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں مبتلا نہ تھے کہ کسی کو مانیں،

کسی کو نہ مانیں اس وجہ سے اللہ نے ان کے لئے ہدایت کی راہ کھول دی اور وہ فائز المرام ہوئے - رہے وہ لوگ جو تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہیں تو اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے - وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں - اپنا انجام خود دیکھیں گے -

اس کے بعد وہ عظیم دعا نمودار ہوتی ہے جو اس امت کے ہر فرد کی صدائے حال ہے - اس کے لفظ لفظ سے اس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روح ایمان ہے - اُن باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لئے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں ان میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں ان سے درگزر کی درخواست بھی ہے - اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے -

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۗ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے - جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے - ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے - یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر - ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم

نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔ (۲۸۵-۲۸۶)

۹۱- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے" یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔ اردو میں کوئی ایسا ترجمہ اس کا جو ان تینوں مفہوموں کو بیک وقت اٹھا لے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آ سکے۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آ سکے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

"فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ" الآیہ۔ اور اس طرح کی دوسری آیات میں، جیسا کہ ہم بار بار اپنی اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں اصل زور جس بات پر ہوتا ہے وہ اس پر ہوتا ہے کہ

خدا کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ خدا کی اس مشیت کے لئے سرے سے کوئی ضابطہ و قاعدہ ہی نہیں ہے۔ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ یہ مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لئے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی اور کے لئے اس میں کسی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔

اس پوری آیت کے موقع و محل پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمہ کی نہایت جامع اور موثر تمہید ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا تھا کہ "شہادت کو نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل اگرچہ معصیت ہو جاتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے" اب اس کے ساتھ اگر یہ مضمون لگا دیجئے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا" تو گویا بات پوری طرح مدلل بھی ہو گئی اور مکمل بھی۔ یہ آیت کا ربط ماسبق سے ہوا۔

آگے سے اس کا ربط جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔ احکام و قوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساسِ دین کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لئے تعلیم شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد نماز کا۔ اب خاتمہ پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لئے توحید کی پھر یاد دہانی کی اور یاد دہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گرانباریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے جوابدہی کے لئے تیار رہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ

رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ"

یہاں رسول اور مسلمانوں کے ایمان کی خبر دینے سے مقصود محض ایک واقعے کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ قرآن کے مخالفین بالخصوص یہود کی مخالفت سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ سورہ کا آغاز یاد ہوگا، اس بات سے ہوا تھا کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں تو کسی شبہے کے لئے گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت پسندی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی، عصبیت اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوں گے وہ اس کتاب پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب یہاں خاتمے پر یہ اعلان فرما دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے واضح کر دیا کہ اس ایمان کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے کون لوگ تھے۔ گویا دودھ کے اندر جتنا مکھن تھا وہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ اس دودھ کے اندر یہ مکھن تھا جو نکل آیا ہے اب جو بچ رہا ہے یہ چھاچھ ہے خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کتاب الٰہی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہوا ہے وہ خود رسول کی ذات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبر بھی اسی سطح پر ہے جس پر عام اہل ایمان ہیں۔ دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اُسے سب سے آگے بڑھ کر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کہتے ہوئے اس کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ ان پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف ایک ہٹ دھرم ہی جھٹلا سکتا ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ میں جن اجزائے ایمان کا ذکر ہوا ہے ان پر ہم اسی سورہ کی آیت ۱۷۷ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں اللہ، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان کی حقیقت سمجھی جائے خاص طور پر فرشتوں پر ایمان کی ضرورت ہم نے وہاں تفصیل سے واضح کی ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف یہاں بھی اشارہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کتاب کا لفظ ہے، یہاں کتاب کے بجائے کُتُب کا لفظ ہے جو کتاب کی جمع ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے لئے تمام رسولوں

پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اہل کتاب صرف اپنی کتاب اور صرف اس نبی یا ان نبیوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جن کو وہ اپنے یا اپنا نبی خیال کرتے ہیں، برخلاف اس کے یہ امت اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتی ہے۔ جہاں تک اجمالی ایمان کا تعلق ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ البتہ چونکہ دوسرے انبیاء اور ان کے صحیفوں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی۔ نیز ان صحیفوں اور ان انبیاء نے خود خبر دی تھی کہ ان کی شریعت کامل نہیں ہے، کامل شریعت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو ملے گی۔ اس وجہ سے ہم قرآن اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی تفصیلی ایمان کی دعوت دنیا کو بھی دیتے ہیں۔

وَلَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، اس ٹکڑے کی شرح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۳۵ کے تحت امت وسط کے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یکایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے یعنی بات غائب کے سے نکل کر جو متکلم کے صیغے میں آگئی ہے یہ دھیان میں رکھنے کی ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو ایمان و عقیدہ بیان ہوا ہے پوری اُمت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں، یہ تمام انبیاء ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں اس وجہ سے ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو رد کر دیں۔ 'احد' کا لفظ چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے، جیسے لستن کاحد من النساء اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ 'بین' کا استعمال صحیح ہے۔

'وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' سمع کا لفظ یہاں مجرد سننے کے معنی میں نہیں بلکہ ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اردو میں بھی سُننے کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں 'سمعنا' کا لفظ دل کی قبولیت کا اظہار کرتا ہے اور 'اطعنا' کا لفظ عملی اطاعت کا۔ اور ایمان و اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس میں یہود کے 'سمعنا وعصینا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ، غفرانک فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اس طرح کے مواقع میں فعل کا حذف دعا کرنے والے کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے جو قبولیت دعا کے لئے ایک نہایت موثر سفارش ہے۔

سمع وطاعت کے اقرار کے بعد معاً دعا کا زبان پر جاری ہو جانا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے، یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پر لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس حقیقت کے شعور نے سمعنا و اطعنا کے اقرار کے فوراً بعد طلب مغفرت کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لئے کہ جب راہ بھی کٹھن ہے اور پرسش بھی ہر پوشیدہ اور علانیہ پر ہونی ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے اور عذاب اور رحمت سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مغفرت کے سہارے کے سوا ہر سہارا بے حقیقت ہے۔ وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ میں کامل سپردگی ہے، یعنی تیرے سوا کوئی نہیں ہے جو کسی پہلو سے مرجع و ماویٰ بن سکے۔ اس میں ایک لطیف تعریض یہود و نصاریٰ پر بھی ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور شرکاء و شفعاء کے اعتماد پر سمع وطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو بیٹھے، لیکن اس امت پر یہ حقیقت واضح ہے کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا اسی کے آگے پیش ہونا اور اسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸۶﴾

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا) یہ دعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع وطاعت کی یہ ذمہ داری جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، ہے تو ایک بھاری ذمہ داری، لیکن اس کے بھاری ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں

ڈالتا، ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کو طاقت عطا ہوئی ہے جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اسی پہلو سے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالایطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے ہی کے لئے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جس کو وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے سمع وطاعت کا عہد لیتے تو از خود یاد دہانی کر کے ان سے "تا بحد استطاعت" کی شرط لکھوا دیتے۔ یہ حضور کی طرف سے اسی آیت کی تعمیل تھی۔ اس میں اہل ایمان کے لئے جو تخفیف اور بشارت ہے وہ بالکل واضح ہے بالخصوص اس موقع پر جب ان پر ایک عظیم شریعت کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور وہ بھگتے گا جو اس نے کیا) یہ بات چونکہ اسی بات کا ایک پہلو ہے جو اوپر گزری ہے اس وجہ سے اسی کے ساتھ اس کو جوڑ دیا ہے اس سے الگ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو نفع یا ضرر جو کچھ بھی پہنچے گا اس کے اپنے عمل ہی سے پہنچے گا، کسی اور شے سے نہیں پہنچے گا۔ جو وہ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا، نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی برائیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نفس پر ذمہ داری اس کی طاقت اور اس کے اختیار کے پیمانے سے ناپ کر ڈالی ہے اس وجہ سے ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس ذمہ داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ، اوپر والا جملہ معترضہ محض اہل ایمان کی تسلی اور ایک مناسب موقع حقیقت کی یاد دہانی کے لئے تھا، اب اصل دعا پھر زبان پر جاری ہو گئی۔ اس ٹکڑے میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی سمع وطاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو غلط طور

پر کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں لیکن معاف شدہ چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کے مزید دروازے کھلتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف تھے، پھر بھی آپ استغفار میں زیادہ سے زیادہ مشقت اٹھاتے تھے جب آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کیا میں یہ نہ چاہوں کہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنوں!

"رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا" "اصر" کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں مثلاً ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۸۱۔ آل عمران (کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں کے لئے میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی)، یہیں سے اس کا استعمال ان بھاری اور گراں ذمہ داریوں اور بوجھوں کے لئے ہوا جن کا اٹھانا دشوار ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یہود کی شریعت میں اس قسم کے اصر اور اغلال جن کی تفصیل سورہ اعراف کی تفسیر میں آئے گی، موجود تھے اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اللہ کی شریعت کو ان بوجھل طوق و سلاسل سے آزاد کر کے اسکو فطرت کی اساس پر قائم کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۱۵۷ (اعراف) (اور ان کے اُوپر سے وُہ دور کرے گا وُہ بوجھ اور وہ طوق جو ان پر پہلے سے ہیں) یہاں دُعا کے ان الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم پر اس قسم کے بوجھ نہ ڈالے جائیں جس قسم کے بوجھ یہود پر اُن کی سرکشی کی وجہ سے ڈالے گئے اور جن کو بالآخر وہ اُٹھا نہ سکے۔ دعا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس امت کے مزاج اور اس کو ملنے والی شریعت کے مزاج میں کامل موافقت ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ، تحمیل کے معنی کسی پر کوئی بھاری بوجھ لادنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سمع و طاعت کی راہ میں آگے جو آزمائشیں پیش آنے والی ہیں ان میں کوئی آزمائش ایسی نہ ہو جو ہماری برداشت سے زیادہ ہو اور جو ہمیں تیری وفاداری کے امتحان میں ناکام بنا دے۔ جہاں تک ابتلاء و امتحان کا تعلق ہے وہ تو لازمۂ ایمان و اسلام بلکہ لازمۂ حیات ہے جس سے اس دنیا میں مفر نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے میں امتیاز اور بندوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے

لئے اس سے گزرنا ضروری ہے اس وجہ سے اس سے بچنے کی دُعا صحیح نہیں ہے لیکن یہ دُعا بندے کو کرتے رہنا چاہئیے کہ کوئی امتحان اس کی طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے امتحان کے معاملے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اعتراف ہی صحیح رویّہ ہے، جو لوگ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کر بیٹھتے ہیں وہ اکثر اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے اس کی ممانعت آئی ہے۔

یہاں اوپر والے ٹکڑے اور اس ٹکڑے کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ اوپر والے ٹکڑے میں تو اس بات کی دعا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جانے کی دُعا ہے جو اس شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آ سکتی ہیں۔

"وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا" اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔ عفو، مغفرت، اور رحم۔ عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کر دینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔ غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انہی تین چیزوں پر ہونا چاہئیے۔ رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے۔ آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔

"أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ" "مولیٰ" کے معنی مرجع کے ہیں جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جائے۔ یہ آخر میں مخالفین اسلام کے مقابل میں مدد و نصرت کی دُعا ہے۔ اس لئے کہ سمع و طاعت کا یہ بار گراں امت نے ایسے حالات میں اٹھایا ہے جب کہ دوسرے، جیسا کہ پچھلی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس بار کو نہ صرف اپنے کندھوں سے پھینک چکے تھے بلکہ اس بنا پر مسلمانوں کے جانی دشمن بھی بن گئے تھے کہ انہوں نے ان کے پھینکے ہوئے اس بوجھ کو سنبھال کیوں لیا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی اس گنہگار اور بے مایہ کو توفیق نصیب ہوئی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

تصحیح

نومبر کے شمارۂ میثاق میں صفحہ نمبر ۴۳ سطر نمبر ۱۶ میں "من هو فی الدنیا اعمیٰ" کی بجائے "ومن كان فی هذه اعمیٰ" کر لیا جائے۔

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

حدیثوں کی جمع و تدوین
میں
اُمت کی غیر معمولی جانکاہی اور احتیاط

حدیثوں کے معتبر و مستند ہونے کا ایک بڑا ثبوت وہ سعی و کاوش اور اہتمام بلیغ ہے جو ان کے نقل و روایت میں پیش نظر رہا ہے۔ ذیل میں اسی پہلو کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے رہنما اور قائد ہیں اور وہ آپؐ کی اتباع و اطاعت کو عین دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ صحابہ کرام کی زندگی میں آپ کی اطاعت و پیروی سے ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہو گئی تھی اس لئے جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا اس موجودہ زندگی سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی مقابلہ کرتے تو خدا کا شکر بجا لاتے۔ خدا نے بھی اپنے اس احسان و انعام کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

(آل عمران ۱۶۴)

اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب ان میں ان ہی کے اندر سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ

اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اللہ نے تمہارے

اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا۔

(آل عمران ۱۰۳)

دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔

اس لئے وہ کامل ذوق و شوق اور پوری توجہ و کاوش سے دین کو سیکھتے اور رسول کی ہر بات معلوم کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو عزت و وقار کی زندگی اسی سے ملی ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ دین اس سانچے اور رنگ میں ڈھل اور رنگ جانے کا نام ہے جس میں رسول اللہؐ ڈھالنا اور رنگنا چاہتے تھے۔

ایک طرف صحابہ کرام کے یہ احساسات کہ دین ہی کی بدولت ان کو ہدایت و سعادت ملی ہے اور آنحضورؐ ان کے مذہبی قائد و رہنما ہیں اس لئے فطری طور پر ان میں آپ کی ہر ہر بات معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ دوسری طرف قرآن اور حدیث نے دین سیکھنے کی ترغیب اور احکام و مسائل دین کی تحصیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّۃً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ۔ (توبہ ۱۲۲)

سارے مسلمانوں کے لئے کوچ کرنا ممکن نہیں تو کیوں نہ ہر فرقہ کا ایک حصہ نکلے تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور تاکہ خبر پہنچا دیں اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کے آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں۔

اس آیت میں اعراب کو جو مدینہ سے دور دیہاتوں میں رہتے تھے ہدایت دی گئی ہے کہ اگر سارے لوگ دربار نبوی میں جا کر دینی بصیرت نہیں حاصل کر سکتے تو ہر طبقہ و جماعت سے کچھ افراد اور لوگوں کو تو ضرور ہی اس کام کے لئے مدینہ جانا چاہئے تاکہ جب وہ وہاں سے واپس ہوں تو اپنی پوری بستی اور جماعت کے لوگوں کو رسول کی باتوں سے واقف کرا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ آنحضرتؐ کی موجودگی کو نہایت غنیمت جانتے تھے اور آپ سے سب کچھ جان اور سیکھ لینا چاہتے تھے ہر شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی خدمت میں گزارے تاکہ دین کو حاصل کر سکے۔ معاش اور اہل و عیال کی ضرورتیں اگر اس راہ میں رکاوٹ بنتیں تو وہ بقدر استطاعت اس کے لئے قربانی دیتے۔ دو آدمیوں کی باری بندھ جاتی کہ ایک دن ایک

آدمی دربارِ نبوی میں جائے اور دوسرا اپنی روزی کا انتظام کرے اور دوسرے دن دوسرا جائے اور پہلا بال بچوں کے لئے کمائے۔ تاکہ ہر ایک کو وہ ساری باتیں جو آپ کے یہاں ہوتی ہیں معلوم ہوجائیں اور بال بچوں کے گزر بسر کا سامان بھی ہوجائے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ اور ان کے ایک پڑوسی کا ایسا ہی واقعہ مذکور ہے۔

یہ تو دین و شریعت معلوم کرنے میں ان کے جوش و سرگرمی کا حال تھا۔ لیکن وہ جس سرگرمی سے دین سیکھتے تھے اسی مستعدی سے دوسروں کو سکھاتے اور بتاتے بھی تھے۔ اور اسے اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے تھے۔

احادیث میں بھی علم دین کی نشر و اشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا :-

نضر الله امرأ سمع منا شيئاً فبلغه كما سمعه فرب مبلغ اوعى من سامع

اللہ اس شخص کو شاداب کرے جس نے ہم سے کوئی چیز سنی اور اسے ویسے ہی دوسروں تک پہنچا دیا جیسے اس نے سنی تھی۔ بعض لوگ جن تک کوئی بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے بار بار بتاکید فرمایا کہ جو باتیں میں تم کو بتلا رہا ہوں وہ دوسرے لوگوں کو بھی ذمہ داری کے ساتھ بتا دینا۔

فليبلغ الشاهد الغائب — موجود غیر موجود تک (میرے احکام) پہنچا دے۔

ان احکام و تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ جو کچھ جانتے تھے اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے اور یہی ذوق و جذبہ ان کے بعد تابعین، تبع تابعین اور آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔

یہ ذوق و جذبہ اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی بزرگ کسی روایت کے متعلق یہ سن لیتے کہ وہ فلاں مقام پر فلاں بزرگ سے معلوم ہوسکتی ہے تو وہ سخت مشقت جھیل کر سفر کرتے اور اُسے معلوم کرکے ہی چین لیتے۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں اس قدر غیر معمولی جد و جہد کی ہے کہ آنحضورؐ کی سیرتِ مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کا کوئی گوشہ اور پہلو مخفی نہ رہنے دیا۔ اس سلسلے میں ان کو بڑی آسانی اس سبب سے رہی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان ہی کے

ساتھ آپ کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ ہوتا تھا۔ لوگ آپ کی خلوت و جلوت ہر ایک میں شریک ہوتے تھے۔ آپ کی حیثیت بادشاہوں اور بڑے آدمیوں جیسی نہ تھی جو اپنے کو بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں اور جنہیں لوگوں سے ملنا جلنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ سب کو اللہ کا پیغام بتاتے اور سکھاتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی بیمار ہوتا تو اس کے گھر جاکر عیادت کرتے، جنازوں میں شریک ہوتے اور ہر شخص کے معاملات اور جھگڑوں کا تصفیہ کرتے۔ اس طرح آپ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جسے ہر شخص پڑھتا اور دیکھتا تھا اور بقدر حوصلۂ ظرف اس سے استفادہ کرتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک خاص قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ عربوں کا حافظہ نہایت قوی تھا اس لئے وہ جو بات بھی سنتے تھے یا دیکھتے تھے اسے محفوظ کر لیتے تھے۔ سیکڑوں طویل قصائد اور ہزاروں اشعار ان کی زبان پر رہتے تھے۔ قدیم وقائع و ایام کے متعلق ان کے سینوں میں جو کچھ از بر اور محفوظ تھا مشکل سفینوں میں وہ محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنا، اپنے قبیلہ کا اور دوسروں کے پشتہا پشت بلکہ اصیل گھوڑوں تک کے نسب نامے ان کے حافظہ میں ہوتے تھے۔ اور فطرت کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جس درجہ زیادہ کام لیا جاتا ہے اسے اُسی قدر زیادہ ترقی ہوتی ہے اور جب ان کے حافظہ کا یہ عالم رہا ہو تو پھر نبیؐ کے اشغال و اعمال جنہیں وہ اپنا دین و ایمان اور جن کی تحصیل کو وہ دین و دنیا دونوں کی سعادت و برکت کا ذریعہ سمجھتے تھے کیوں نہ پوری مستعدی اور ذمہ داری سے محفوظ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثیں محفوظ اور اس درجہ مستند شکل میں آج موجود ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ صحابہؓ کے حافظہ نے وہ کام کیا جو تحریری یادداشتیں بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ آنحضورؐ نے ابتداء میں حدیثوں کی تحریر و کتابت سے جو منع کیا تھا اسکی وجہ علاوہ قرآن میں التباس و اختلاط کے یہ بھی تھی کہ یہ چیز ان کی ذہانت اور حافظہ پر اثر انداز ہوتی۔ تاہم یہ ممانعت آخر میں ختم ہوگئی تھی اور بعض صحابہ نے آپ کے احکام و ہدایات نقل بھی کر لئے تھے کیونکہ انہیں اپنی یادداشت پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔

ان وجوہ و اسباب کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ حدیثوں کی نشر و اشاعت میں صحابہؓ نے پورے

شوق، دلچسپی اور توجہ سے حصہ لیا اور ان کے حافظہ نے اس شوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ اس درجہ کامل انہماک واشتغال کے بعد یہ ناممکن ہے کہ آنحضورؐ کے اعمال واشغال کا معتدبہ حصہ محفوظ ہونے سے رہ گیا ہو۔

ایک طرف اگر اس درجہ جوش وولولہ تھا کہ رسول اللہؐ کی کوئی بات مخفی نہ رہ جائے اور جو کچھ بھی آپ نے فرمایا ہے اسے جان لیا جائے اور دوسروں کو بھی بتا دیا جائے۔ تو دوسری طرف ہوش سے بھی کام لیا گیا یعنی یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھی گئی کہ جو کچھ بھی آپ سے بیان کیا جائے وہ پورے وثوق واحتیاط اور کامل اطمینان کے بعد ہی بیان کیا جائے۔ صحابہ جوش عقیدت میں سرشار ضرور تھے لیکن اس جوش نے غلط وصحیح میں امتیاز کی قوت وصلاحیت کو ختم نہیں کر دیا تھا کہ غلط سلط سب کچھ وہ نقل وبیان کر دیتے۔ اس احتیاط کا اندازہ درج ذیل باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

قرآن وحدیث نے جس طرح کتمان علم کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح روایت حدیث میں تحقیق وتفتیش اور چھان پھٹک کو بھی ضروری قرار دیا ہے:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا (حجرات ۵)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں نہایت ضروری ہدایات دیں۔ اس قسم کی چند روایتیں مسلم شریف کے مقدمہ سے نقل کی جاتی ہیں۔

حضرت ابوہریرۃ جو مخالفین حدیث کے طبقہ میں کثرت روایت کی وجہ سے خاص طور پر مطعون ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔

جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ گھڑا تو اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنائے!

انہی سے ایک اور روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ بھی سنے اسے وہ (بے تحقیق) بیان کرنے لگے۔

حضرت علیؓ اپنے خطبوں میں کہا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:۔

لا تکذبوا علی فانہ من یکذب علی یلج النار۔

مجھ پر جھوٹ مت گھڑو کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ گھڑے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:۔

من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین

جس نے میری طرف سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جسے وہ جھوٹ سمجھ رہا ہے تو ایسا شخص بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

غور فرمایئے کہ صحابہ کرام جن کا مقصدِ زندگی ہی آنحضرت صلعم کے اقوال واعمال اور طرز واداکی تقلید رہا ہو اور جنہوں نے پورے ذوق وشوق اور مستعدی سے آپ کے اقوال واعمال اس لئے سیکھے اور سکھائے ہوں کہ آپ کے سانچے میں خود ڈھلیں اور دوسروں کو ڈھال دیں، کیا یہ غلط سلط روایتیں بیان کر سکتے تھے۔ غلط سلط روایتیں بیان کرنا یوں ہی کیا کم قابل مذمت فعل ہے لیکن جب معاملہ دین کا ہو۔ اور غلط سلط روایتیں بیان کرنے پر ایسی سخت اور شدید وعیدیں بھی ہوں تو اس کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی کہاں رہ جاتا ہے۔

اب صحابہؓ کی احتیاط پسندی کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے۔

بعض صحابہؓ کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تکثیر روایت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ سبب ہرگز نہ تھا کہ وہ حدیثوں کو معتبر نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ آپ کی جانب کوئی غلط بات منسوب ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرۃؓ جو کثیر الروایت ہیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسقدر آزادی سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرۃؓ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک دنیا میں رہے ان کے سامنے متعدد واقعات پیش آتے رہے ان کا خود بیان ہے کہ اگر قرآن مجید میں دو آیتیں اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا الی قولہ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنی روزی روزگار میں لگے رہتے تھے اور انصار اپنی کھیتیوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے اور میں برابر خدمت نبوی میں

حاضر اور آپ کے ارشادات سنتا رہتا تھا۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اپنے والد حضرت زبیرؓ سے عرض کرتے ہیں کہ آپ فلاں فلاں بزرگوں کی طرح روایتیں کیوں نہیں بیان کرتے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ مجھے آپؐ کی صحبت میں رہنے کا ضرور موقع ملا ہے، لیکن میں نے آپ سے سنا ہے: من کذب علیّ فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے حدیثیں بیان کرنے کے لئے کہا گیا تو ارشاد فرمایا کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہمارا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے کا معاملہ نہایت اہم ہے۔

سائب بن زید فرماتے ہیں کہ میں سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ گیا لیکن میں نے ان سے کوئی حدیث نہ سنی۔

شعبی کا بیان ہے کہ میں ایک برس تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں رہا لیکن ان کو آنحضرتؐ کی طرف کوئی بات منسوب کرکے بیان کرتے ہوئے نہ سنا۔

حضرت انس بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بیان کرتے تو اس خوف سے کہ آپؐ کی جانب کوئی غلط بات منسوب ہو جائے او کما قال بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آنحضورؐ کے متعلق جب کوئی بات بیان کرتے تھے تو کانپ اٹھتے اور لرز جاتے تھے اور یہ کہتے کہ یہ یا اسی طرح کی بات آپ نے بیان کی ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی احتیاط پسندی تو مشہور ہی ہے وہ بسا اوقات ایک شخص سے کوئی روایت سنتے تھے تو مزید اطمینان کے لئے کسی اور شخص کو بھی ثبوت و شہادت کے لئے طلب کرتے تاکہ وہ بھی اس روایت کی تائید کر دے۔

حضرت علیؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ روایت بیان کرنے والے سے قسم لے کر اطمینان حاصل کرتے تھے۔

جرح و تعدیل کا اصطلاحی فن گو محدثین کی ایجاد ہے لیکن عہد صحابہؓ ہی میں اس کی بنیاد

پڑ چکی تھی اور وہ باقاعدہ روایتوں اور راویوں پر نقد کرتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حضرت عائشہؓ سے جب رویتِ الٰہی کے متعلق روایتیں بیان کی گئیں تو انہیں ان کے قبول میں تامل ہوا۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی:۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت کو کہ "مردہ پر اگر نوحہ کیا جائے تو اسے قبر میں عذاب ہوتا ہے"، یہ کہہ کر رد فرمایا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "من حمل جنازۃ فلیتوضأ" جس نے جنازہ اٹھایا اسے وضو کر لینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ خشک لکڑیوں کے چھونے یا اٹھانے سے وضو لازمی نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت ابن عباس سے یہ حدیث بیان کی کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آگ سے پکی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" حضرت ابن عباس نے کہا: "تب تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازمی ہے۔" حضرت ابوہریرہؓ نے کہا: "بھتیجے جب تم آنحضورؐ کی کوئی حدیث سنو تو کہا و تیں نہ کہا کرو!"

ام المومنین حضرت عائشہؓ تو راویوں کے حفظ و ضبط کا امتحان بھی لیتی رہتی تھیں چنانچہ اپنے بھتیجے حضرت عروہ بن زبیر سے ایک مرتبہ کہا کہ ہمارے اس سفر حج میں عبداللہ بن عمر بھی شریک ہیں۔ ان کے پاس علم حدیث کا وسیع ذخیرہ ہے اس لئے ان کی ملاقات کرکے کچھ روایتیں سنو، چنانچہ انہوں نے ایسا کیا اور منجملہ متعدد روایات کے انہوں نے عبداللہ بن عمر سے یہ حدیث بھی سنی کہ:۔ ان اللہ لا ینزع العلم من الناس انتزاعا ولکن یقبض العلماء فیرفع العلم معھم ویبقی فی الناس رؤس جھال یفتونھم بغیر علم فیضلّون و یُضلّون۔ حضرت عروہ نے جب اس روایت کا ام المومنین سے ذکر کیا تو انہوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کہا کیا انہوں نے تم سے ایسے بیان کیا اور یہ کہا ہے کہ انہوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ عروہ نے اثبات میں جواب دیا۔ دوسرے سال پھر حج کے موقع پر حضرت عائشہؓ نے عروہ سے کہا ابن عمر کے پاس جاکر پھر علم والی روایت

معلوم کرو۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے اسے بعینہٖ اسی طرح بیان کیا۔ جس طرح گذشتہ سال بیان کیا تھا۔ تو ام المومنین نے فرمایا کہ بیشک ابن عمرؓ صحیح بیان کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے روایت میں کوئی کمی بیشی نہیں کی ہے۔

صحابہ کرام کے زمانہ سے یہ احتیاط بھی چلی آرہی ہے کہ جن روایتوں کے عام لوگ متحمل نہ ہو سکیں اور وہ ان کی فہم سے بالاتر ہوں انہیں نہ بیان کیا جاتے۔ اس سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک مشہور واقعہ ہے جس کو امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں نقل کیا ہے۔ حضرت بن جبلؓ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ صدق قلب سے اگر کسی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام قرار دے گا۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں یہ بشارت لوگوں کو بھی سُنا دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں! ایسا نہ کرو ورنہ لوگ اسی پر اکتفا کرلیں گے" حضرت معاذ نے اپنی وفات کے وقت یہ روایت اس لئے بیان کی کہ وہ کتمانِ علم کے گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔

اسی طرح کی ایک روایت امام مسلم نے کتاب الایمان میں نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جب آنحضورؐ سے یہ بشارت سنی کہ من قال لا الٰہ الا اللہ صدقا من قلبہ دخل الجنۃ تو اس کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو انہیں زدوکوب کیا اور آنحضرتؐ کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا کہ کیا آپ نے ابو ہریرہؓ سے اس طرح کی بات کہی ہے؟ آپؐ نے جواب دیا ہاں: حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ لوگ اسی پر تکیہ کر لیں اور عمل سے باز آجائیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ عمل کرتے رہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم کسی جماعت سے اگر ایسی بات کی روایت کروگے جو اس کی عقل و فہم سے ماوراء اور بالاتر ہو تو وہ اس کے لئے باعث فتنہ ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول کریمؐ سے دو طرح کی باتیں سیکھی ہیں ایک طرح کی باتیں تو میں نے لوگوں سے بیان کر دیں۔ لیکن اگر دوسری قسم کی باتیں بھی ان سے بیان کردوں تو یہ گردن کٹ جائے گی۔

اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں متعدد مفسدے ہو سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ چونکہ اس نوعیت کی احادیث لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوتی ہیں اس لئے

وہ راوی ہی کو جھوٹا سمجھنے لگتے ہیں جس سے ثقہ و ضابط لوگوں کی ثقاہت و ضبط پر اثر پڑتا ہے اسی لئے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے بیان بھی کر دے۔

دوسرے ان روایتوں کا کچھ سے کچھ مطلب نکال کر لوگ احکام شرع کے تارک و مخالف ہو جائیں گے۔

تیسرے لوگوں کو دین کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ خُدا اور رسول کی تکذیب و تردید پر آمادہ ہوں گے اسی لئے حضرت علیؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ۔

حدثوا الناس بما یعرفون اتریدون ان یکذب اللہ و رسولہ

لوگوں کو وہی باتیں بیان کرو جن کو وہ جانتے ہوں (جو ان کی فہم سے ماوراء اور جو ان کے نزدیک مستبعد نہ ہوں) کیا تم پسند کرتے ہو کہ (لوگوں کی عقل سے بالاتر روایتیں بیان کی وجہ سے) خُدا اور رسول کی تکذیب کیجائے۔

غرضیکہ صحابہ کرام نے احادیث کے نقل و روایت میں نہ تو کسی طرح کی کوئی کوتاہی کی اور نہ ان کی صحت کی چھان بین اور احتیاط میں کوئی دقیقہ فروگذاشت رکھا۔

ان کے بعد تابعین، تبع تابعین، فقہا، محدثین اور علمائے اسلام نے بھی روایات کے نقل کرنے میں اسی طرح سعی و کاوش اور تحقیق و احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے حدیثوں کے ضبط و روایت میں جس قدر تحقیق و کاوش، چھان بین اور احتیاط سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

"اس باب میں تمام دنیا متفق ہے کہ اس حیثیت سے اسلام نے اپنے پیغمبر کی اور نہ صرف پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی حضرتؐ کی ذات مبارک سے تھا جس طرح حفاظت کی ہے وہ عالم کے لئے مایۂ حیرت ہے۔ ان لوگوں کو جو آنحضرت صلعم کے اقوال، افعال، اور متعلقات زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے، راویان حدیث، روایت یا محدثین اور ارباب سیر کہتے

ہیں جن میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایۂ روایت تحریری صورت میں آگیا تو ان تمام راویوں کے نام و نشان تاریخ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قید تحریر میں لایا گیا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعۂ اقوال کا نام اسماء الرجال ہے۔"

(خطبات مدراس طبع سوم ص ۳۴)

علامہ شبلیؒ دوسری قوموں اور مسلمانوں کے اصول سیرت اور تحریر واقعات کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس قسم (زبانی روایتوں کے قلمبند کرنے) کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ رس؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں۔ جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے گئے۔ ان تحقیقات سے فن اسماء الرجال (بیوگرافی) کا

وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی۔ بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔" (سیرت النبی جلد اول صفحہ ۳۸، ۳۹ طبع چہارم)

پھر یہی نہیں کہ صرف راویان حدیث کے متعلق اس قدر چھان بین کی گئی بلکہ نفس روایت کی تحقیق و صحت کے لئے بھی جس حد تک احتیاط و تحقیق ممکن تھی وہ سب کی گئی مثلاً روایت کے متن کو پرکھا گیا۔ اس کے متعلق صحیح، حسن، ضعیف، متصل، مرسل، مرفوع، منقطع، متصل، مقلوب، مشہور، غریب، متواتر، آحاد، افراد، معروف، شاذ، منکر، معلل، موضوع، مدرج، ناسخ، منسوخ، خاص، عام، مجمل، مبین، اور دوسرے مختلف و متعدد انواع کی معلومات حاصل کی گئیں۔ اور یہی سب امور علم حدیث کا اصل موضوع ہیں۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:۔

ان المراد من علم الحديث تحقيق معانى المتون و تحقيق علم الاسناد و المعلل ۔ والعلة عبارة عن معنى فى الحديث خفى يقتضى ضعف الحديث مع ان ظاهرهٔ السلامة منها وتكون العلة تارة فى المتن وتارة فى الاسناد وليس المراد من هذا العلم مجرد السماع ولا الاسماع ولا الكتابة بل الاعتناء بتحقيقه و البحث عن خفى معانى المتون والاسانيد و الفكر فى ذلك ودوام الاعتناء به ومراجعة اهل المعرفة به ومطالعة كتب اهل التحقيق فيه وتقييد ماحصل من نفائسه وغيرها فيحفظها الطالب بقلبه ويقيدها

علم حدیث کا مقصد معانی متون، علم اسناد اور معلل کی تحقیق ہے۔ حدیث کے اندر علت اس معنی خفی کو کہتے ہیں جو اس کے ضعف کی متقاضی ہو لیکن بظاہر حدیث اس عیب سے پاک معلوم ہوتی ہو۔ یہ علت کبھی متن میں اور کبھی اسناد کے اندر ہوتی ہے۔ علم حدیث کا مقصد محض سننا سنانا اور کتابت نہیں بلکہ تحقیق حدیث میں اعتناء، متون و اسانید میں بحث و تفتیش، اس میں غور و فکر اور ہمیشہ اس کی جانب توجہ و انہماک اور اس فن کے واقفکاروں سے مراجعت، ماہرین و محققین فن کی کتابوں کے مطالعہ اور اس کا عمدہ انتخاب کرنا وغیرہ سب علم حدیث کے مقصود میں داخل ہے تاکہ طالب حدیث اسے

بالکتابة ثم يديم مطالعة ما كتبه ويتحرى التحقيق فيها يكتبه و يتثبت فيه فانه فيما بعد ذلك يصير معتمدا عليه ويذاكر بمحفوظاته من ذلك من يشتغل بهذا الفن سواء كان مثله في المرتبة او فوقه او تحته فان بالمذاكرة يثبت المحفوظ ويتحرر ويتأكد ويتقرر ويزداد بحسب كثرة المذاكرة ومذاكرة حاذق في الفن ساعة انفع من المطالعة والحفظ ساعات بل اياما وليكن في مذاكراته متحريا الانصاف قاصدا الاستفادة او الافادة غير مترفع على صاحبه بقلبه ولا بكلامه ولا بغير ذلك من حاله مخاطبا له بالعبارة الجميلة اللينة فبهذا ينمو علمه وتزكو محفوظاته والله اعلم

(شرح نووی برحاشیہ مسلم)
جلد اول صفحہ ۴۷ و ۴۸
مطبع مصریہ ازہر ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء

یاد کرے اور قید تحریر میں لائے نیز جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کا بار بار مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تحقیق و جستجو کرنا کیونکہ اس کے بعد وہ خود مستند و مرجع بنے گا۔ طالب حدیث کا یہ بھی کام ہے کہ اس فن میں اشتغال رکھنے والوں سے اپنے محفوظات کے متعلق مذاکرہ کرے خواہ اس طرح کے لوگ اس کے ہمسر ہوں یا بلند تر اور کمتر ہوں کیونکہ مذاکرہ سے اس کی یاد کی ہوئی چیز اور زیادہ ثابت و پختہ ہوگی اور کثرت مذاکرہ سے اس کے علم میں خود بھی اضافہ ہوگا اور کسی حاذق و ماہر سے ایک گھنٹہ کا مذاکرہ کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کے مطالعہ و حفظ سے زیادہ مفید ہے۔ لیکن مذاکرہ میں انصاف، استفادہ یا افادہ کا قصد ہونا چاہیئے اور افادہ کی صورت میں جس سے مذاکرہ کیا جائے اس پر اپنی برتری اور ترفع کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے نہ دل سے نہ بات سے اور نہ کسی اور ادا سے بلکہ نہایت نرم و خوبصورت انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے اس طرح سے اس کے علم میں اضافہ اور یادداشتوں میں زیادتی ہوگی۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے متعلق نہایت اہم اور قابل غور حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:-

واعلم وفقك الله تعالى ان الواجب

جس شخص کو صحیح و سقیم روایات اور ثقہ و متہم

على كل احد عرف التمييز بين صحيح الروايات وسقيمها وثقات الناقلين لها من المتهمين ان لا يروى منها الا ما عرف صحة مخارجه والستارة في ناقليه وان يتقى منها ما كان منها عن اهل التهم والمعاندين من اهل البدع والدليل على ان الذي قلنا من هذا هو اللازم دون ما خالفه قول الله جل ذكره (يا ايها الذين امنوا ان جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا ان تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين) وقال جل ثناؤه (ممن ترضون من الشهداء) وقال عز وجل (واشهدوا ذوى عدل منكم) فدل بما ذكرنا من هذه الآى ان خبر الفاسق ساقط غير مقبول وان شهادة غير العدل مردودة والخبر وان فارق معناه معنى الشهادة في بعض الوجوه فقد يجتمعان في اعظم معانيهما اذ كان خبر الفاسق غير مقبول عند اهل العلم كما ان شهادته مردودة عند جميعهم ودلت السنة على نفى رواية المنكر من الاخبار كنحو دلالة القرآن على

راویوں کی تمیز اور پرکھ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ایسی روایتیں بیان کرے جن کے صحت مخارج اور ناقلین کی ثقاہت کے متعلق اسے واقفیت ہو۔ اور ان روایتوں کے نقل و بیان سے احتراز کرنا چاہیئے جو متہم اور اہل بدع معاندین سے مروی ہوں۔ اس بات کے لازمی اور ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو ورنہ کہیں نادانی سے کسی قوم پر جا پڑو اور پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو) نیز خدا نے فرمایا "ممن ترضون من الشہداء" (ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو گواہوں میں) اور یہ بھی فرمایا کہ "واشہدوا ذوی عدل منکم" (اور گواہ بنا لو اپنے اندر سے دو معتبر شخصوں کو) ان آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ فاسق کی خبر ساقط اور غیر مقبول ہے اور غیر عادل شخص کی شہادت مردود ہے۔ شہادت اور خبر کے مفہوم میں گو بعض اعتبار سے فرق ضرور ہے لیکن اہم اور عظیم مفہوم میں دونوں یکساں ہیں۔ اس لئے کہ

على نفى خبر الفاسق وهو الاثر المشهور عن رسول الله صلى الله عليه وسلم (من حدث عنى بحديث يرى انه كذب فهو احد الكاذبين) (مقدمہ صحیح مسلم مع شرح نووی صفحہ ۶۱ و ۶۲ مطبع مصریہ ازہر ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء)

جس طرح فاسق کی خبر تمام اہل علم کے نزدیک غیر مقبول ہوتی ہے اسی طرح اس کی شہادت بھی سب کے نزدیک قابلِ رد ہے اور حدیث و سنت سے منکر روایت کا عدم قبول و نفی اسی طرح ثابت ہے جس طرح قرآن مجید سے خبرِ فاسق کا عدم قبول ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور روایت ہے کہ من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فہو احد الکاذبین (جس نے مجھ سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کو وہ جانتا تھا کہ یہ غلط اور جھوٹی ہے تو وہ بھی ایک جھوٹا ہوا)

احادیث کے متعلق اس درجہ احتیاط سے کام لیا گیا کہ محدثین نے کتب حدیث کے جو مجموعے مرتب و مدون کئے اور جو اس زمانہ میں متداول ہیں وہ بار بار کی حک و اصلاح اور انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ امام احمدؒ اپنی مسند کے متعلق فرماتے ہیں :-

هذا الكتاب جمعته وانتقيته من اكثر من سبعمائة الف حديث وخمسين الفا (الحدیث والمحدثون ص۳۷۱)

یہ مجموعہ میں نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔

امام بخاری کی صحیح میں مکررات کو شامل کر کے سات ہزار سے کچھ زیادہ حدیثیں ہیں لیکن علماء کا بیان ہے :-

انه اختارها وصحت عنده من ستمائة الف حديث كانت متداولة في عصره (فجر الاسلام ص۲۵۳)

اس کو انھوں نے ۶ لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا جو خود ان کے نزدیک صحیح اور اس زمانہ میں متداول تھیں۔

امام ابوداؤد نے ۵ لاکھ حدیثوں سے صرف ۴ ہزار آٹھ سو منتخب حدیثیں اپنی سنن میں شامل کیں۔

امام نسائی نے پہلے سنن کبریٰ مرتب کی تھی لیکن پھر اس میں انتخاب سے کام لے کر سنن صغریٰ الموسوم بہ المجتبیٰ مرتب کی۔

امام ترمذی نے اپنی جامع کے متعلق جب پورا اطمینان کر لیا اور عام علماء نے اس کی توثیق و تحسین کر دی تب اسے منظر عام پر لائے۔

عرضت هذا الكتاب على علماء الحجاز والعراق وخراسان فرضوا به واستحسنوه - (الحطہ ص[illegible])

میں نے اس کتاب کو حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اس پر رضامندی اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا بھی ہے۔ اس موقع پر یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان لوگوں نے جن حدیثوں کو نظر انداز کر دیا اور انہیں اپنی کتابوں میں شامل نہیں کیا وہ سب غلط نہ تھیں بلکہ ان کے خاص معیار و اصول اور سخت شرائط پر وہ پوری نہیں اترتی تھیں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حدیثوں کی روایت اور تحریر میں جس طرح جوش و خروش اور غیر معمولی سرگرمیوں سے کام لیا گیا اور اس کی کوشش کی گئی کہ آنحضرت صلعم کی ہر حدیث ضبط تحریر میں آ جائے اور آپ کا کوئی قول و عمل عام نگاہوں سے مستور نہ رہ جائے۔ اسی طرح ان کے نقل و بیان میں کامل ہوش و احتیاط کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور اس بات کی سعی و کاوش میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کوئی غلط سلط اور جھوٹی بات منسوب نہ ہو جائے۔

کیا اس قدر سعی و کاوش اور انتہائی احتیاط و ضبط کے بعد بھی حدیثوں کو ناقابل تسلیم و حجت اور غیر مستند کہنے کے لئے کوئی گنجائش اور وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے۔

یہ بات اگر کہی جائے تو کچھ قرین قیاس بھی ہے کہ یہ تمام کاوش و احتیاط انسان کی ہے اور انسانی کاوش و احتیاط میں غلطیوں کا امکان ہوتا ہے، لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس امکان کی بھی تو ایک حد ہوگی۔ ایسا تو ناممکن ہے کہ ساری کاوشیں لاحاصل اور تمام کوششیں ہی بے سود ہوں۔ اور جملہ احتیاط کے بعد بھی سارا ذخیرۂ احادیث باطل اور دفتر بے معنی ہی رہے۔

غالباً اسی امکان کی بناء پر علماء نے اخبار آحاد کو موجب علم و یقین کہنے میں تامل اور احتراز کیا ہے۔ اور اسی بناء پر نقلی حیثیت سے متعدد حدیثوں کی قطعیت اور صحت پر خود محدثین و فقہا

کے زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اور عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کو بھی احادیث کی صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے اور جو حدیثیں اس کے مخالف نظر آئی ہیں ان کو خود صحابہ نے بھی ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اصولی حیثیت سے اُنّاس نے تسلیم کیا ہے کہ حدیث ایک حجت شرعی اور اس کا ایک معتدبہ حصہ عقلی و نقلی اعتراضات سے محفوظ ہے۔ باقی حدیثوں کو سرے سے لائقِ اعتبار و قابلِ تسلیم و حجت نہ سمجھنا تو ہمارے زمانے کے بعض ذہین اور جدت و اختراع پسند لوگوں کا کام ہے اور ان لوگوں کا سب سے بڑا سہارا محدثین کا وہ اصُول ہے کہ حدیثیں اگر قرآن و عقلِ صریح کے خلاف ہوں تو ناقابلِ قبول ہیں لیکن قرآن سے ان لوگوں کی واقفیت کا حال بڑا ہی دردناک ہے۔ اپنی طبیعت و مزاج سے یہ اس کی جیسی غلط سلط تعبیریں چاہتے ہیں کر لیتے ہیں اور ان تاویلات باردہ اور دور از کار تعبیروں کو بنیاد بنا کر حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔ اقبال نے ایسے ہی متجددین کے متعلق کہا تھا ؂

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر ۔۔۔ چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

رہا عقل کا معاملہ تو اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ عقلِ عمومی کے بجائے محض انفرادی عقول کو معیار بنا لیا جائے۔ کسی حدیث کے کسی خاص انسان کی عقل کے نزدیک خلافِ عقل ہونے اور واقعۃً خلاف ہونے میں بڑا فرق ہے۔ پھر ان حضرات کے نزدیک وہی عقل قابلِ معیار ہے جسے یورپ نے پیش کیا ہے لیکن اپنی گرہ کی عقل، اپنے مذاق، اپنی روایات اور اپنی خصوصیات کو سامنے رکھنا تو ان کے نزدیک رجعت پسندی اور بے عقلی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی فکر و نظر کا کوئی فساد اور بگاڑ ہو سکتا ہے کہ اختراع و اکتشاف پسندی کے مدعی لوگ یورپ کی اندھی تقلید کو تو اپنے لئے قابلِ فخر تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس ذاتِ گرامی کی اتباع و تقلید نہ تو خود کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرتا دیکھ سکتے ہیں جس کی آمد سے دنیائے ظلمت و جہالت کی بنیادیں ڈھے گئی تھیں۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آج کل مذہب کے خلاف اس کی اصلاح کے پردہ میں جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں وہ سب یورپ ہی کی صدائے بازگشت ہیں اور اس میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ دینی حدود وغیرہ سے آزادی حاصل کی جائے اور یورپ کی غلامی و تقلید کے مضبوط بندھنوں میں اپنے کو جکڑ دیا جائے۔ اور لطف و حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اندھی تقلید و غلامی کو آزادیٔ فکر و اجتہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ ::

بحث و نظر

امین احسن اصلاحی

خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب

(۴)

تحدید آبادی اور حکومتِ الٰہیہ

خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں ڈاکٹر صاحب نے کتاب و سنت اور امام غزالیؒ کا جو حوالہ دیا تھا اس کی حقیقت آپ نے دیکھ لی۔ اب ہم ان کی ایک اور دلیل کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں جو موصوف نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے پہلو سے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں نکالی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔

"آج ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعداد کم ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم معاشی بدحالی میں گرفتار ہیں، جسمانی لحاظ سے کمزور ہیں، عام طور پر ناکافی خوراک کے شکار اور مایوس کن حد تک کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس حقیر سرو سامان کے ساتھ ہمیں اس دنیا کا سامنا کرنا ہے جس میں ہر طرف جسمانی، اخلاقی اور ذہنی مسابقت کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں لازماً اسلام ہمارے لئے تحدید آبادی کو اس وقت تک کے لئے ضروری قرار دے گا جب تک ہم اپنے معیارِ زندگی کو مذکورہ ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگ نہ کر لیں یہ فعل یقیناً غیر اسلامی ہے کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کرتے رہیں جن کے لئے مناسب غذا اور تعلیم کا ہم کوئی انتظام نہ کر سکیں اور یقیناً نبی کریم حشر کے روز ایک ایسی امت پر فخر نہ کر سکیں گے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہو مگر نیم فلاکت زدہ، ناچار، بیمار اور جاہل مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہو۔ ..... پھر اس امر کا قوی ثبوت موجود ہے کہ قرآن حکیم اور سنتِ نبویؐ دونوں مسلمانوں کے لئے یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ قوی، صحت مند اور خوش حال ہوں تاکہ کرۂ ارضی پر

حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ فریضہ وہ قوم انجام نہیں دے سکتی جو افلاس، بیماری اور جہالت سے گھری ہوئی ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہاں تحدید آبادی کے حق میں اکٹھی تین دلیلیں پیدا کی ہیں اور ان تینوں ہی کو اپنے حد تک مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

ایک تو یہ کہ ہم جسمانی اور مادی اعتبار سے نہایت فلاکت زدہ اور کمزور ہیں اور اس وقت مقابلہ درپیش ہے ایسی قوموں سے جو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہم سے بدرجہا بلند ہیں، ان حالات میں لازماً ہم پر اسلام یہ واجب کرتا ہے کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کرنے کے بجائے پیدائش اولاد کو گھٹائیں اور پہلے اپنے معیار زندگی کو ترقی یافتہ قوموں کے معیار پر لائیں، پھر فراغت سے بچے پیدا کریں۔

دوسری یہ کہ قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس امت کی کثرت پر فخر کریں گے یہ وہ امت نہیں ہے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہے لیکن نیم فلاکت زدہ، ناچار، بیمار اور جاہل مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے بلکہ اس اُمت پر فخر کریں گے جو صحت مند اور خوش حال ہو۔

تیسری یہ کہ قرآن اور سنت مسلمانوں پر یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ قوی، صحت مند اور خوش حال بنیں تاکہ کرۂ ارضی پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تینوں دلیلیں بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا تجزیہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے اندر جتنی حقیقت ہے اس سے کہیں زیادہ کھوٹ ہے۔ چنانچہ اب اختصار کے ساتھ ہم بالترتیب ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہلی دلیل کے ترتیب دینے میں اتنی بات تو صحیح کہی ہے کہ اس وقت ہمارا مقابلہ ایسی قوموں سے ہے جن کا معیارِ زندگی نہایت اونچا ہے لیکن یہ بات اُن کی بالکل غلط ہے کہ ان قوموں کے مقابلے کے لئے اسلام ہم پر یہ واجب کرتا ہے کہ ہم بچوں کی پیدائش کو روک کر پہلے اپنا معیار زندگی ان کے معیار پر لائیں تب ان کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر کچھ بھی اجتماعیات کا مطالعہ کیا ہے تو وہ اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ قوموں کی ہار جیت کا فیصلہ معیار زندگی کے میدان میں نہیں ہوتا بلکہ قومی و اجتماعی کردار کے میدان میں ہوتا ہے۔ اگر ایک قوم کا اجتماعی اور قومی کردار مضبوط اور بلند ہوگا تو وہ دُوسری کمزور قومی و اجتماعی کردار والی قوم پر بازی لے

جائے گی اگرچہ اس کا معیارِ زندگی کتنا ہی اونچا ہو۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ اس کی صداقت کی شہادت دے رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اسلام کی تاریخ پر غور فرمائیں کہ رومیوں ایرانیوں اور مصریوں کے مقابل میں عربوں کا معیار زندگی کتنا پست تھا لیکن اسلام کی تعلیم نے جب ان کے قومی و اجتماعی کردار کو ان کی حریف قوموں کے مقابل میں بلند کر دیا تو وہ آناً فاناً اپنے تمام حریفوں پر چھا گئے اور انہیں اپنی اس کامیابی کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کا سہارا حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بچے بھی بے تحاشا پیدا کرتے رہے اور فتوحات پر فتوحات بھی بے تحاشا حاصل کرتے رہے۔ یہی حال ان قوموں کا بھی ہے جو آج دنیا میں کامیاب اور ترقی یافتہ ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ جس دور میں ان کی ترقی و کامیابی کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں اس زمانے میں تو وہ خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط تولید وغیرہ کی اصطلاحوں تک سے ناواقف تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر مسلمانوں کو دوسری قوموں کی مسابقت کا درس دینا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انہیں سب سے پہلے اجتماعیات کے اُس حصے کا مطالعہ کرنا چاہئے جس میں قومی ترقی میں قومی کردار کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں ابن خلدون کو اجتماعیات کے ایک عالم کی حیثیت سے بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے مشہور مقدمے میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قوم میں وہ کردار جو غلبہ اور کامیابی کی راہیں کھولتا ہے اسی وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک اس کے افراد زندگی کے تعیشات سے دور رہتے ہیں۔ جب کسی قوم میں معیار زندگی اونچا کرنے کے لئے تنافس شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب اس کے زوال کا دور شروع ہوگیا۔ یہ چیز اس کے اس قومی کردار کو فنا کر دینے والی ہے جو قومی ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابن خلدون کے اس نظریئے کے بالکل برعکس یہ فرماتے ہیں کہ ہماری قومی ترقی کا پہلا قدم معیار زندگی اونچا کرنے کی مسابقت ہے اور اس کے لئے خاندانی منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ اس وجہ سے آج اسلام ہمارے لئے یہ ضروری قرار دے گا کہ ہم تحدیدِ آبادی کے پروگرام پر عمل کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری بات بھی بالکل غلط ہے۔ جس شخص کو قرآن اور حدیث کا کچھ بھی علم ہوگا اس کے لئے یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں اپنی امت کے باب میں تفاخر و مباہات کی جو چیز رہی ہے وہ معیارِ زندگی کی بلندی نہیں ہے

بلکہ ایمان اور عمل کی بلندی ہے۔ غریب سے غریب نادار سے نادار اور گنوار سے گنوار شخص نے بھی اگر ایمان واسلام کی راہ اختیار کر لی ہے تو آپ کی نگاہوں میں اس لئے عزت و محبت کا نہایت بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ ایمان وعمل صالح کی دولت سے محروم رہے آپ کی نگاہوں میں انہوں نے ادنیٰ جگہ بھی نہیں پائی اگرچہ ان کا معیار زندگی کتنا ہی اونچا رہا ہو۔

آپ کے تمام ابتدائی ساتھی نہایت غریب لوگ تھے اور آپ کو ان پر فخر تھا۔ آپ کی قوم کے اندر جو لوگ اونچا معیار زندگی رکھتے تھے وہ آپ کے غریب، ناتواں اور کمزور ساتھیوں کو حقیر سمجھتے تھے اور آنحضرت صلعم سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دور کر دیں تو ہم آپ کی مجلس میں آسکتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا اور اپنے غریب ساتھیوں کی زیادہ سے زیادہ شاندار الفاظ میں دلداری فرمائی۔ اپنے ان غریب ساتھیوں کو آپ نے کبھی یہ ہدایت نہیں فرمائی کہ تم اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کی فکر کرو، جب بھی تاکید فرمائی اسی بات کی تاکید فرمائی کہ اپنے علم وعمل اور اپنے اخلاق وکردار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور مستحکم کرنے کی فکر کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی یہ خیال آیا کہ اگر اونچے معیار زندگی رکھنے والے لوگ ایمان لاتے تو اس سے اسلام کو تقویت حاصل ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی کہ تم ان اونچے معیار زندگی والوں کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ۔ یہ معیار زندگی کے اعتبار سے جتنے اونچے ہیں فہم وبصیرت کے اعتبار سے اتنے ہی نیچے ہیں اللہ اپنے کلمے کو انہیں کمزوروں اور ناداروں کے ذریعہ سے بلند کرے گا جن کو یہ بلند معیار زندگی رکھنے والے لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی مستقبل میں امت کی عظیم فتحمندیوں کی طرف اشارہ فرمایا تو جہاں اس بات کا ذکر فرمایا کہ ایک دن تم قیصر وکسریٰ کے خزانے غنیمت میں پاؤ گے وہیں اس اندیشے کا بھی اظہار فرمایا کہ مبادا اس وقت تم دنیا کے تنافس اور معیار زندگی اونچے کرنے کے فتنے میں مبتلا ہو جاؤ اور پھر تمہیں بھی یہ دنیا اسی طرح ہلاک کر چھوڑے جس طرح اس نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کر چھوڑا ہے۔ میں یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اگر چاہوں تو اس کی تائید میں درجنوں آیات اور بیسیوں نہایت ایمان افروز احادیث نقل کر سکتا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کے سامنے ان آیات و احادیث کے سنانے کا فائدہ کیا؟

آنحضرت صلعم نے جس طرح دنیا میں معیار زندگی کی اصلی بلندی ایمان وعمل صالح کو قرار دیا اسی طرح آخرت میں بھی آپ انہی لوگوں پر فخر فرمائیں گے جو ایمان وعمل صالح کے ساتھ حوض کوثر پر پہنچیں گے۔ آپ کی امت کا وہ غریب چرواہا جس نے زندگی بھر ریڈیو اور ریفریجریٹر کی شکل بھی نہیں دیکھی اور جو زندگی کی کسی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوا لیکن اپنے ایمان بھرا اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا دفن ہوا وہ "امتی امتی" کے شرف خطاب ومباہات سے سرفراز ہوگا لیکن جو لوگ مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود خدا کی شریعت پر تحریف کی قینچیاں چلاتے رہے اور شریعت فروشی کے سرمایے سے اپنے معیار زندگی اونچے کرتے رہے، جب وہ حوض کوثر کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں گے تو فرشتے ان کو دھکے دیں گے، حضورؐ اُن کے بارے میں پوچھیں گے کہ اُن کو کیوں روکا جا رہا ہے، حضورؐ کو اطلاع دی جائے گی کہ آپ کے بعد انہوں نے آپ کی شریعت میں بدعتیں اور تحریفیں کی ہیں، حضورؐ بھی فرمائیں گے کہ "فسحقا سحقا" اگر یہ بات ہے تو یہ دور ہوں، ان کو دفع کرو!!

اس روشنی میں ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی تصحیح کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر پر اپنی جس امت کی اکثریت پر فخر فرمانے والے ہیں اس کی مشترک خصوصیت ایمان واسلام اور اخلاق وکردار ہے۔ اس کو کوئی تعلق بھی معیار زندگی کی اونچائی نیچائی سے نہیں ہے۔ وہاں امت وضو کے آثار اور سجدوں کے نشانات سے پہچانی جائے گی، کوٹھیوں اور کاروں سے نہیں پہچانی جائے گی۔ اگر آپ حضرات یہ چیز نہ پیدا کر سکے اور ضبط ولادت کی برکت سے آپ نے ہر گھر میں ریڈیو اور ریفریجریٹر ہی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن سیٹ بھی پہنچا دیئے تو اس پر آپ کو فخر ہو تو ہو حضورؐ کو اس پر فخر کیوں ہوگا؟ یہ چیزیں تو ان لوگوں کے گھروں میں بھی موجود ہیں جو اللہ و رسول کے باغی اور شیطان کے نہایت وفادار دوست ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بھی بالکل بے حقیقت ہے کہ دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے "قومی صحت مند اور خوشحال ہونا شرط ہے"۔ ہمارے نزدیک اس کی پہلی شرط سچا ایمان، خالص اسلام، مضبوط ارادہ اور غیر متزلزل عزم ہے۔ قوم کے اندر یہ چیزیں نہ ہوں تو ایک ایک گھر کے اندر قارون کی دولت جمع کر دیجئے لیکن خلافت الٰہیہ قائم نہیں ہو سکتی۔ عرب جب اونٹ چراتے تھے، تہذیب وتمدن کے تعیشات سے نا آشنا تھے، کھجور اور پانی پر گزارا کرتے تھے۔ اسی وقت محض ایمان کی بدولت جبرالٹر سے لے کر دیوار چین تک انہوں نے اللہ کی حکومت قائم کر دی لیکن

آج جب کہ ان کے صوا ڈالر اگل رہے ہیں اور ان کے جھونپڑوں تک میں ریل سینما، ریڈیو اور ریفریجریٹر کی برکتیں پہنچ رہی ہیں انہیں خلافت الٰہیہ کا نام بھی کبھی یاد نہیں آتا۔ دوسروں کو چھوڑئیے خود اپنے ہی کو دیکھئے، جب دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم ہوئی تھی اس زمانے کے لحاظ سے آج پاکستان میں آپ زیادہ قوی، صحت مند اور خوش حال ہیں لیکن ۱۷ سال کے عرصے میں کتنے قدم آپ نے حکومتِ الٰہیہ کی راہ میں اٹھائے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کثرت آبادی کی مصیبت کے سبب سے ہمارے ہر گھر میں ٹیلی ویژن اور ریفریجریٹر بہم نہیں ہو سکا ہے، یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے سینوں میں ایمان اور دلوں میں ارادہ ہی موجود نہیں ہے؟ ڈاکٹر صاحب اگر ایمان کو کچھ اہمیت دیتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ قوم کے اندر ایمان پیدا کرنے کے لئے ۱۷ سال کی مدت میں کیا کام ہوا ہے؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ حضرات نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے نئی نسل کو اگر کوئی ولولہ دیا ہے تو یہ دیا ہے کہ وہ اپریشن کرا کرا کے نامرد اور بانجھ بنے اور معیارِ زندگی اونچا کرنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرے! کیا حکومت الٰہیہ اسی طرح قائم ہوئی ہے؟

اشتراکیت یا خاندانی منصوبہ بندی

ڈاکٹر صاحب نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ضبط تولید کو بروئے کار لائے بغیر اس درجے کی معاشی خوش حالی پیدا کی جائے جو ہمارے قومی تقاضوں کو پورا کر سکے" اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صرف ایک شکل میں ممکن ہے، وہ یہ کہ ملک میں اشتراکی نظام قائم کیا جائے لیکن اس میں قباحت وہ یہ بتاتے ہیں کہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی کی قربانی دینی پڑے گی۔ برعکس اس کے اگر خاندانی منصوبہ بندی کے نسخے پر عمل کیا جائے تو فرد کی آزادی بھی سلامت رہتی ہے اور معاشی خوشحالی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ملک میں خوش حالی پیدا کرنے کی یہی دو راہیں ہیں۔ خوشحالی نہ تو قید خانے کے نظام سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ منظم نسل کشی سے۔ خوشحالی پیدا کرنے کے لئے ضرورت ایک ایسے نظام کے قیام کی ہے جو مندرجہ ذیل باتوں کا پورا پورا اہتمام کرے۔

۱۔ عمالِ حکومت (خاص طور پر ارباب مناصب) سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی بسر کریں تاکہ اُن کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بنے اور قومی خزانے پر ان کا بار کم سے کم پڑے۔

۲۔ ہمارے ملک میں حصولِ دولت کے جو ذرائع موجود ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور ان کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ استحصال اور جلبِ زر کے وہ تمام راستے بند کر دیئے جائیں جو اسلام میں ممنوع ہیں۔

۴۔ عیاشی اور فضول خرچی کی وہ راہیں روک دی جائیں جن سے اسلام نے روکا ہے۔

۵۔ خوشحال طبقے کے اندر انفاق، کفایت شعاری اور سادگی کا جذبہ ابھارا جائے اور اس کا نمونہ خود ارباب اقتدار پیش کریں۔

میں ڈاکٹر صاحب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انہی چند باتوں کو سچائی اور مضبوطی کے ساتھ عملاً کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے چند سال کے اندر اندر اپنے ملک کا یہ حال کر دیا تھا کہ لوگ مدینہ کی گلیوں میں اپنی زکوٰۃ کا مال لئے پھرتے تھے لیکن کوئی ان کا طالب نہیں ملتا تھا۔ آج بھی اگر ہمارے ملک کے ارباب اقتدار محنت، کفایت اور ایثار تین چیزوں کو اپنی زندگی کے نصب العین کی حیثیت سے اختیار کر لیں اور اپنے عملی نمونوں اور اپنے تعلیمی و تبلیغی ذرائع سے یہ چیزیں اپنی قوم کے ہر طبقے میں بھی پیدا کر دیں تو یہاں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے گا جو فی الواقع حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا اہل ہوگا۔ اس کامیابی کے لئے شرط بس ایک ہے۔ وہ یہ کہ جو لیڈر یہی جو حکومت کے کرتا دھرتا ہیں اور جو لوگ اس تبدیلی کے علمبردار ہیں، وہ محض زبان سے لوگوں کو اس کی تلقین نہ کریں بلکہ اس کے لئے خود اپنے آپ کو عملی نمونے کے طور پر پیش کریں۔ رہا ضبط ولادت اور معیارِ زندگی اونچا کرنے کا نسخہ تو اس سے نہ آج تک دنیا میں کسی قوم نے اپنی مشکل حل کی ہے اور نہ ہم حل کر سکے گی۔ یہ محض بچگانہ خیالات ہیں اور ہمارا یہ مشورہ ہے کہ ان خیالات کو چھوڑ کر زندگی کے حقائق کا مواجہ کرنے کی ہمت کی جائے۔ کمیونزم کا مقابلہ خاندانی منصوبہ بندی کے بند باندھنے سے نہیں ہوگا، اس کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے کہ اس نظام کو برپا کیا جائے جس کے سربراہ حضرت عمرؓ تھے اور اس مقصد کے لئے کام کرنے والے نمونہ بھی اپنے سامنے انہی کا رکھیں۔

مصالح مرسلہ

ڈاکٹر صاحب اور ان کے زمرے کے ارباب قلم اپنے ہر مضمون میں "مصالح مرسلہ" کی اصطلاح ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن میں نے ہمیشہ

یہ محسوس کیا ہے کہ اس اصطلاح کو یہ حضرات محض سنی سنائی معلومات کے اعتماد پر استعمال کرتے ہیں، ورنہ اس کا جو مفہوم یہ حضرات لیتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس مفہوم کے لئے اس اصطلاح کے بانیوں نے اس کو وضع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس اصول کی رُو سے "ملت کی اجتماعی بہبود کے مسائل کو اولیت دینا ضروری ہے" یعنی ایک امر میں شریعت کے احکام کچھ ہوں لیکن اگر حضرات آج یہ رائے قائم کرلیں کہ اس معاملے میں اجتماعی بہبود کا تقاضا فلاں ہے تو اس "بنیادی اور مستند اصول" کی رُو سے ڈاکٹر صاحب کو یہ حق حاصل ہے کہ شریعت کے نصوص و احکام کو بالائے طاق رکھ کر اس کو اختیار کرلیں۔ ڈاکٹر صاحب ذرا دیر کو یہ سوچیں کہ آخر وہ کون سر پھرا فقیہ ہو سکتا ہے جو ساری شریعت کو منسوخ کرنے کے لئے یہ اصول بنا جائے۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو مصالح مرسلہ کا مطلب یہ لے کہ اجتماعی بہبود کے مزعومات کے لئے شریعت کے احکام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مصالح مرسلہ کی اصطلاح جن فقہا نے وضع کی ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مسلمانوں کے وہ اجتماعی مسائل ہیں جن میں اللہ اور رسول نے کوئی حکم دینے کے بجائے ان کو مسلمانوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کو مرسلہ (چھوڑے ہوئے) کہتے ہیں، یعنی اللہ و رسول نے ان میں حکم نہیں دیا بلکہ ان کو مسلمانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ حالات کے تقاضوں کے تحت جس بات میں اپنی مصلحت سمجھیں اس کو اختیار کریں۔ اس کا کوئی تعلق بھی ان معاملات سے نہیں ہے جن میں شریعت نے اپنے احکام دے دیئے ہیں۔ جن میں شریعت کے احکام موجود ہیں ان میں مصلحت اور بہبود اللہ و رسول کی طرف سے متعین ہو گئی، وہ چھوڑی ہوئی مصلحتیں نہیں ہیں کہ بندے ان میں دخل در معقولات کے مجاز ہوں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان دائروں کے اندر بھی مداخلت کی راہ کھولنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندوں کے مصالح اللہ اور رسول سے زیادہ سمجھنے کے مدعی ہیں۔

ایک اہم سوال کے جواب سے گریز

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے اخیر میں ایک نہایت اہم سوال اٹھایا ہے لیکن اس کے جواب سے گریز اختیار فرمایا ہے حالانکہ ان کا مضمون پڑھ کر ہر شخص کے ذہن میں وہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی یہ ذمہ داری تھی کہ یا تو اس کا کوئی اطمینان بخش جواب دیتے اور اگر ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا تو پھر یہ مضمون لکھنے کی زحمت نہ اٹھاتے۔ ہم ڈاکٹر صاحب

کا سوال و جواب دونوں خود ان کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"البتہ منصوبہ بندی کرتے وقت ہمیں یہ متعین کرنا ہوگا کہ ہمارے معیار زندگی میں اضافے کے حدود کیا ہیں؟ مثال کے طور پر مغرب میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مسلسل محنت شاقہ کی مدد سے ہر طرح کی اشیائے صرف کو بڑھانے اور جمع کرنے کی لامتناہی جد و جہد میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک کار کے بعد دوسری کار اور ایک ٹیلی ویژن سیٹ کے بعد دوسرا ٹیلی ویژن سیٹ خریدیں گے مگر دوسرا بچہ حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ ہم یقیناً یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو لیکن بالفرض ایسے حالات پیدا ہو بھی جائیں تو مناسب قانونی یا انتظامی تدابیر سے ان کا بآسانی مداوا کیا جا سکے گا۔"

ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بیماری یہی معیار زندگی اونچا کرنے کی ہوس ہے، چھوٹے بڑے سب اس میں مبتلا ہیں اور یہی بیماری ان تمام خرابیوں کا باعث ہے جو آج رشوت، خیانت، چور بازاری، ملاوٹ، سود، سٹہ، جوا وغیرہ کی صورتوں میں ہمارے اندر موجود ہیں اور جو برابر بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ اب اگر اسی ہوس کو مزید بڑھانے کی جد و جہد ڈاکٹر صاحب ایک قومی نصب العین کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ بیماری کس حد تک بڑھے گی اور اس کے اثرات کن شکلوں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ خیال کہ معیار زندگی کی بلندی کیلئے کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے ایک احمقانہ خیال ہے اور اس سے زیادہ احمقانہ خیال یہ ہے کہ جب ضرورت پیش آ جائے تو لوگوں کو اس حد پر روکا جا سکتا ہے۔ آج جو لوگ ہمارے اندر بلند سے بلند معیار زندگی رکھتے ہیں ان سے پوچھ دیکھئے، کیا وہ اپنے معیار زندگی پر قانع ہیں؟ وہ رات دن اس کو مزید اونچا کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر وہ ان تمام معیارات کو لانگ گئے ہیں جو اُن کے اپنے ملک میں موجود تھے تو اب ان کے سامنے مثال امریکہ کے بلند معیاروں کی ہے اور وہ اُن کی سطح پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہی جذبہ تکاثر و تنافس ان لوگوں کے اندر ہے جو ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اگر مکان ہے تو کوٹھی کی طلب ہے، کوٹھی ہے تو کار کی جستجو ہے، کار مل گئی تو ٹیلی ویژن کے ارمان ہیں، یہ سب ہو گیا ہے تو بینک بیلنس کی فکر ہے۔ کسی کارخانے، کسی فیکٹری، کسی بینک میں حصہ داری

کا ولولہ ہے۔ پھر کار ایک ہی کیوں ہو، خاندان کے ہر فرد کے لئے الگ الگ کیوں نہ ہو؟ ریڈیو، ریفریجریٹر، ٹیلی ویژن سٹ سے کوٹھی کا ایک ایک گوشہ آراستہ کیوں نہ ہو؟ کاریں ہیں تو پرائیویٹ ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر کیوں نہ ہوں؟ سمندری سیروں کے لئے آغاخاں اور شاہ فاروق کی طرح اپنے مخصوص جہاز کیوں نہ ہوں جو جملہ سامان عیش سے اس طرح آراستہ و پیراستہ ہوں کہ ان کے عرشہ پر فردوسِ جنت کا دھوکا ہو۔ شاہ سعود نے جو محل بنوائے اور جس طرح کی کاریں اور ہوائی جہاز ان کے لئے تیار ہوئے آخر دوسرے ان سے کیوں محروم رہیں اور دنیا سے ان کی حسرت لئے ہوئے کیوں جائیں۔ الغرض معیارِ زندگی کی کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی۔

پھر فرض کر لیجئے کہ معیارِ زندگی کے لئے آپ کوئی حد معین کر دیتے ہیں تو آخر اس حد پر آپ لوگوں کو روکیں گے کس طرح؟ کیا اس کے لئے قانون اور انتظام کی مشینری استعمال کریں گے؟ اگر یہ ارادہ ہے تو کیا اس سے شخصی آزادی کی قربانی نہیں دینی پڑے گی؟ پھر اس نظام میں اور اشتراکیت میں فرق کیا ہوگا؟ اگر ڈاکٹر صاحب اس کا جواز تسلیم کرتے ہیں تو اس التزام کی ضرورت تو آج بھی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اندر ایک طبقہ تو آج بھی ان لوگوں کا پیدا ہو چکا ہے جن کا معیارِ زندگی اس پیمانے سے بہت اونچا ہے جس پیمانے کو ڈاکٹر صاحب غالباً آخری حد اس ملک کے لئے قرار دیں گے۔ پھر جس شد و مد سے ڈاکٹر صاحب خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں مضمون لکھ رہے ہیں ان لوگوں کو روکنے کے لئے مناسب قوانین بنانے کی فکر کیوں نہیں کرتے جو معیارِ زندگی کے تمام حدود پھاندتے ہوئے اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب شاید ان کو واپس لانا ناممکن ہو جائے۔ اور اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ مطلوبہ معیار سے ابھی ان کا معیار بھی نیچا ہی ہے، ان کو اس سے بھی آگے جانے کی ضرورت ہے اور جب تک پاکستان کے عام باشندے اس معیار کو نہ حاصل کر لیں اس وقت تک انہیں بچے نہیں پیدا کرنے چاہئیں تو ہم افسوس کے ساتھ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ معیارِ زندگی اونچا کرنے کی یہ بھاگ دوڑ کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں ہے، اس کو یا تو قیامت ختم کرے گی یا اس کا قدرتی ردِ عمل جس کو اشتراکیت کہتے ہیں۔

خوشحالی حاصل کرنے کی راہ خاندانی منصوبہ بندی اور معیارِ زندگی کی بلندی کے لئے تنافس و تکاثر نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، محنت، کفایت اور ایثار ہے۔ خلفائے راشدین نے قوم میں جو خوشحالی پیدا کی وہ اسی راہ سے کی۔ انہوں نے خود اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ

بنایا۔ وہ نہایت محنت کی زندگی بسر کرتے، روکھا سوکھا کھاتے، پیوند لگے کپڑے پہنتے، اور دوسروں کے لئے ایثار کرتے۔ ان کی معاشی پالیسی یہ تھی کہ جو لوگ وسائل و ذرائع رکھتے ہیں ان کو معیارِ زندگی اونچا کرنے کا روگ لگنے نہ پائے بلکہ اپنی دولت غریبوں اور بے وسیلہ لوگوں اور ملک و قوم کی بہبود و ترقی کے لئے خرچ کرنے میں لذت اور سعادت محسوس کریں۔ چونکہ ان کی اپنی زندگیاں بالکل ان کے اس نظریے کا عملی نمونہ تھیں بلکہ انہوں نے اس معاملے میں حدِ ضروری سے بھی زیادہ احتیاط اور تقویٰ کو پیشِ نظر رکھا تھا اس وجہ سے انہیں کسی قانون اور انتظام کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کی اقتدا کے شوق نے ان کے تمام عمال کو بھی ان کے رنگ میں رنگ دیا۔ اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جو اس نصب العین کے خلاف نظر آئی تو معمولی تنبیہ سے اس کی اصلاح ہو گئی۔ بڑوں کے ان عملی نمونوں نے عوام کی طبیعتوں کو بھی اسی رُخ پر موڑ دیا۔ وہ بھی اپنی محنت کے ثمرات کو اپنے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کے بجائے مذہب اور قوم کے معیار کو اونچا کرنے پر صرف کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی تھی اور ایسی خوشحالی جس کے لئے نہ خاندانی منصوبہ بندی کے کلینک کھولنے پڑے اور نہ اشتراکیت کی قسم کا کوئی جبری نظام لوگوں پر مسلط کرنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب اگر خوشحالی کی راہ کھولنا چاہتے ہیں تو قوم کے سربراہوں کو یہ راہ اختیار کرنے کی دعوت دیں۔ اس سائنس کے دور میں اگر یہ راہ ہمارے لیڈروں نے اختیار کر لی تو برسوں کی منزل وہ ہفتوں میں طے کریں گے اور چند برسوں میں وہ ان شاء اللہ ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کر لیں گے۔ رہی یہ خاندانی منصوبہ بندی کی راہ، تو ڈاکٹر صاحب مضمون لکھتے رہیں گے، قوم بچے پیدا کرتی رہے گی اور معیارِ زندگی کی تگ و دو ایک دن اس طرح قوم کا دیوالہ نکال دے گی کہ ترقی تو درکنار اس کے لئے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا میں قائم رہنا بھی شاید مشکل ہو جائے۔

ایک ضروری تنبیہ

مضمون کے آخر میں ایک ضروری تنبیہ کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ خاندانی منصوبہ بندی

کی اسکیم کے خلاف لکھا ہے یہ اسکیم میرے نزدیک مذہب، عقل، فطرت اور اصول صحت سب کے خلاف ہے۔ میں نے اس دوران میں وہ لٹریچر بھی منگا کر پڑھا ہے جو اس اسکیم کو فروغ دینے کے لئے ہمارے ملک میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اگر میری یہ تنقید ڈاکٹر صاحب کے مضمون تک محدود نہ ہوتی تو میں اس پر بھی تنقید کرتا۔ تاہم یہ بات ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کر چکا ہوں، فطرت اور صحت کے ان اصولوں کا مخالف نہیں ہوں جو پیدائش اولاد کے سلسلے میں ملحوظ رکھنے ضروری ہیں۔ فطرت نے ایک بچے کے بعد دوسرے بچے کی ولادت کے درمیان ماں باپ کے لئے ایک خاص وقفے کا انتظار ضروری قرار دیا ہے۔ بعض حالات میں فریقین میں سے کسی کی صحت بھی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ فریقین جنسی تعلق سے احتراز کریں۔ اس طرح کی ساری چیزیں فطرت کے مقتضیات میں سے ہونے کی وجہ سے داخل شریعت ہیں اور جو لوگ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ قانون فطرت کے مطابق ان کی سزا اسی دنیا میں نقد نقد پا لیتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح خاص اس پہلو میں بھی ہمارے ہاں اصول صحت سے سخت بے پروائی پائی جاتی ہے اور یہ بے پروائی صرف عوام اور جہلا ہی میں نہیں بلکہ خواص اور تعلیم یافتہ طبقے میں بھی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ایک صحت مند اور مضبوط قوم بننے کے لئے اپنی ان خامیوں کی اصلاح کرنی ہوگی۔ جنسی تعلقات اور پیدائش اولاد سے متعلق طبی اصولوں کا علم ہماری قوم میں عام ہونا چاہیئے۔ اور ان اصولوں کو لوگوں کے اندر مقبول بنانے کے لئے تمام ہوشمند شہریوں کو جدوجہد کرنی چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے ہاں جو ادارہ خاندانی منصوبہ بندی کی ایک غلط اور بے سود اسکیم چلا رہا ہے۔ اگر وہ اپنے اس غلط کام کو چھوڑ کر لوگوں میں پیدائش اولاد سے متعلق اصول صحت کے اہتمام اور ضبط نفس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اس کی یہ خدمت ہر پہلو سے نہایت مفید ہوگی۔

ان سطروں پر تنقید تمام ہوتی ہے۔ اس مسئلے کے بعض اور پہلو وضاحت طلب ہیں لیکن اس مضمون میں ان سے تعرض کی گنجائش نہیں تھی۔ خدا نے چاہا تو وہ ایک مستقل مضمون میں بیان ہوں گے۔

محمد ادریس، پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس، لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔